ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

بازگوئی

سُرِیندر پرکاش

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

BAAZ GOYEE *(Short Story)*
By
SURANDER PARKASH

سال اشاعت ۱۹۸۸ء
تعداد ۱۰۰۰
قیمت ۵۰ روپے
ناشر محمد مجتبیٰ خاں (مسٹر انڈیا)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶
فون ۵۲۶۱۶۲ - ۷۷۴۹۶۵
مطبع فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، بارہ دری شیر افگن
بلّی ماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی عزیز الدین وکیل۔ ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ لال کنواں دہلی

انتسابْ

باعث تحریر آنکہ

جو کہ مبلغ ایک عدد زندگی کا ہے — نصف جسکا دشت گردی میں گذر گیا اور نصف آبلہ پائی میں — وصول پائی اور وعدہ کرتا ہوں کہ اَنداں طلب ادا کر دوں گا لہٰذا رسید لکھ دی ہے۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

العبد

گواہان۔

۱۔ محمود ہاشمی ۲۔ دیویندر اِسّر

مورخہ: ۲۶ مئی ۱۹۳۰

ترتیب

بازگوئی اور تازہ گوئی

ایک زمانہ تھا جب سُریندر پرکاش کا نام تعارف کا اور ان کے افسانے تشریح کے محتاج تھے۔ آج وہ زمانہ ہے کہ سریندر پرکاش کا افسانہ برِصغیر میں افسانے کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو افسانے کی تنقید، اور خود نئے اُردو افسانے کی رہبری کا بار اپنی جانِ ناتواں پر اٹھانے کے متمنی ہیں لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ افسانے کی بنیادی شعریات کیا ہے، منٹو کے بعد افسانہ اگر بدلا ہے تو کیوں بدلا ہے اور وہ کون سے خصائص ہیں جو نئے افسانے کو پرانے افسانے سے ممتاز کرتے ہیں؟ کیوں کہ یہ معاملہ صرف پلاٹ اور کردار، علامت یا تجرید، سماجی معنویت اور سیاسی شعور کا نہیں۔ جب تک یہ بات پوری طرح نہ واضح ہو کہ نئے افسانہ نگار نے کن چیزوں سے اپنا رشتہ توڑا ہے اور کیوں، اس وقت تک نئے افسانے کی تنقید ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ امر باعثِ حیرت نہ ہونا چاہیئے کہ بعض لوگوں کو سریندر پرکاش کے بعض افسانے مشکل الفہم نظر آتے ہیں، اور کچھ دوسرے افسانے، مثلاً ''بجوکا'' اور ''بازگوئی'' انھیں اپنے مقصد کے مطابق دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جس تخلیقی شعور نے ''تلقارمس'' اور ''جمغورہ الفریم'' کو جنم دیا، وہی شعور ''بجوکا'' اور ''بازگوئی'' میں بھی کارفرما ہے۔ کسی ایک افسانے کو دوسروں سے الگ کر کے دیکھنے کا طریقہ نئے افسانے کی تنقید کے لئے مناسب نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ تمام افسانوں میں ایک ہی طرح کا تخلیقی شعور کارفرما ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ سریندر پرکاش کے تمام افسانے مل کر ایک نامیاتی کلیت بناتے ہیں۔ ان میں فکر، اسلوب اور

جذبے کی وحدت ہے، اور اس وحدت کا سُراغ ان کی علامت سازی میں پنہاں ہے۔
یہ علامت سازی منطق سے ماورا ہے اور اس کا عمل زمانی نہیں بلکہ مکانی ہے۔
سُریندر پرکاش بے مثال خوبصورت نثر لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ شعوری تناؤ نہیں جو مثلاً انور سجاد کا خاصہ ہے نہ انکے یہاں وہ دھوکے باز، بظاہر آسان لیکن بہ باطن بہت پیچیدہ، گفتگو کی روانی ہے جو انتظار حُسین کی صفت ہے،
سریندر پرکاش کے اسلوب میں ایک پُر اسرار چالاکی ہے۔ ان کی نثر میں نظم کی سی نزاکت ہے، اور نظم ہی کی طرح اکثر یہ نہیں کھُلتا کہ ان کے لہجے میں طنز کا پلہ بھاری ہے یا حزن کا؟ اور اگر طنز ہے تو وہ کس پر؟ خود اپنے پر، قاری (یعنی سننے والے) پر، یا ان لوگوں پر جو اُن کے افسانوں میں دبے پاؤں کچھ اس طرح گذرتے اور چلتے ہیں گویا ساری دُنیا خاموش ہو اور وہ اس خاموشی کو اپنی شخصیت کا جز سمجھتے ہوں۔
ایملی برانٹی EMILY BRONTE کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی کی موت کا بھی بیان کرتی ہے تو اتنے سہج طریقے سے، جیسے کوئی دروازہ بہت آہستہ سے بند ہو گیا ہو۔
سریندر پرکاش کے افسانوں میں تشدد VIOLENCE اور تخویف TERROR کا بھی بیان اسی سہج انداز میں ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ وہ اپنے جذبات اور اپنی نثر، دونوں پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ ان کا تازہ افسانہ "بھولا کی واپسی" (افسوس کہ وہ اس مجموعے میں شامل نہیں) اس بات کی عمدہ مثال ہے۔ "بازگوئی" کا ایک اقتباس دیکھیئے:

> ان پر پتھّر برسانے والے اکثر مرد، بچّے اور عورتیں رو رہے تھے۔ پتھّر پھینکتے ہوتے ان کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے۔
> جب کسی کا پتھّر مجرموں پر ٹھیک نہ بیٹھتا، اس کے جسم پر سیاہ کے کوڑے شڑاپ سے پڑتے اور وہ تیزی سے پتھّر اٹھا کرنے لگ جاتا۔ پتھر اکٹھا کرتے ہوتے کئی بار وہ مجرموں کے قریب پہنچ جاتا اور سہمی ہوئی نظروں سے

ان کی طرف دیکھتا۔ غیر متوقع طور پر ان کی آنکھوں میں خوف کے برعکس فرشتوں کی شفقت دکھائی دیتی۔

یا پھر "آرٹ گیلری" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جہاں اسرار MYSTERY اور ABSURD ایک ہو گئے ہیں، لیکن طنز کا احساس پھر بھی ہوتا ہے:

جب رات کو ہم اپنے گھر کے چراغ روشن کرتے ہیں تو ان کے پرتو سے پھولوں کے ریشے چمک اٹھتے ہیں اور ان کی روشنی میں چڑیاں اپنا رات کا کھانا تیار کرتی ہیں۔ اور بچوں کو کھلا کر خود سو جاتی ہیں۔ نیچے زمین میں ایک گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع رہتا ہے۔ چڑیاں اپنے بچوں کو صبح اس پانی سے نہلا کر تیار کرتی ہیں۔ پھر سامنے جنگل سے ایک بھیڑ اور ایک شیر خراماں خراماں اس گڑھے تک پہنچتے ہیں — ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں اور اپنا چہرہ پانی کے عکس میں دیکھ کر شیک ہینڈز کرتے ہیں اور مسکراتے ہوئے پھر جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں۔

شروع شروع میں سریندر پرکاش کے افسانوں میں اسرار MYSTERY کا عنصر غالب تھا اور بعض لوگوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی تھی کہ اس اسرار کے پیچھے کیا اسرار ہے؟ اسی لئے میں نے عرصہ ہوا سریندر پرکاش کی علامتوں کو خواب کی علامتوں سے تشبیہہ دی تھی کہ وہ خود منطق سے بالاتر ہوتی ہیں اور ایک دوسری کائنات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس زمانے میں سریندر پرکاش اپنی برہمی اور دُنیا میں انسان کی زبوں حالی پر اپنے احتجاج کی لے پر بے معنویت ABSURDITY کی نقاب ڈالے رہتے تھے۔ بعد کے افسانوں میں اس نقاب میں جگہ جگہ سے ننھے منے سوراخ بنا دیئے گئے ہیں۔ سریندر پرکاش اپنی تمام تر ظاہری غیر سنجیدگی کے باوجود بہت باشعور اور منتشم نئی احساس کے افسانہ نگار ہیں۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ یہ سوراخ خود انھیں

نے بناتے ہیں، تاکہ کم فہم لوگوں کو آسانی ہو سکے۔ ممکن ہے یہ بات اچھی ہو۔ ممکن ہے خراب ہو، میں ابھی اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا، کیوں کہ ابھی مجھ پر اس طریق کار کا پورا اثر واضح نہیں ہوا ہے۔ اغلب ہے کہ کثیر تعداد میں ایسے افسانے سامنے آئیں تو پتہ چلے کہ ان سوراخوں کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت ان سے ایک فائدہ تو ہوا ہے کہ کم ہمت اور کم کوش قاری کو تھوڑی سی آسانی ہو گئی ہے، اور مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ سُریندر پرکاش کی برہمی بعض اوقات ان کے مزاج پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ کھُل کر بولنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب سُریندر پرکاش انسانی المیہ اور انسانی طربیہ کو یک جا کر دیتے ہیں تو اس وقت وہ پھر اپنی پراسرار نقاب اوڑھ کر قاری کو تحیّر، تجسس اور خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور اس طرح ایسا افسانہ خلق کرتے ہیں جسے مکمل معنوں میں اسطوراتی MYTHOPOEIC کہا جا سکتا ہے اسطوراتی افسانے کے میدان میں سُریندر پرکاش اپنی برتری ہر ایک پر ثابت کر دیتے ہیں۔ پنجاب کے قتل و خون پر اچھا افسانہ لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ۱۹۴۷ کے فسادات پر۔ بیدی نے "لاجونتی" لکھ کر ہندوستانی عورت کو MYTHOPOEIC بنا کر دکھا دیا تو سُریندر پرکاش نے بیدی ہی کے افسانے "بھولا" کو دوبارہ لکھ کر پورے انسانی المیے کا اسطور ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ سُریندر پرکاش کے افسانے میں بھولا کا ماموں گھر نہیں پہنچتا، اور نہ بھولا اور اس کا ماموں ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دہشت گردوں کے ہاتھ ماموں کی موت ہو جاتی ہے، حالانکہ ماموں اور دہشت گردوں میں ایک طرح کا روحانی اتحاد بھی ہے۔

پچھلی نسل کے بڑے افسانہ نگاروں میں بیدی کو سُریندر پرکاش کا پیش رو کہا جا سکتا ہے، اس معنی میں کہ دونوں نہایت ٹھنڈے دماغ کے افسانہ نگار ہیں اور دونوں اپنی برہمی کو طنز اور اسطور میں بدل دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ بیدی تو کبھی کبھی جذباتیت کے شکار ہو بھی جاتے ہیں، لیکن سُریندر پرکاش پر جذباتیت

بہت کم حاوی ہو پاتی ہے۔ پھر بیدی کے یہاں MYSTERY اور TERROR دونوں کا عنصر سُریندر پرکاش سے کم ہے۔ یہ اسی اسراری احساس کا کرشمہ ہے کہ سُریندر پرکاش نے پریم چند کے ہوری اور بیدی کے بھولا کو اٹھا کر اپنے افسانوں میں نیا روپ دے دیا۔ ممکن ہے سُریندر پرکاش یہ کہنا چاہتے ہوں کہ کائنات میں ایک واحد اسرار ہے جو ہر چیز پر محیط ہے۔ کوئی چیز ویسی نہیں جیسی نظر آتی ہے، لیکن وہ جیسی بھی ہے، کسی ایسے نظام کا حصّہ ہے جہاں خیالی مخلوق بھی اصلی ہے اور اصلی مخلوق بھی خیالی ہے۔

> جیسے ہی وہ قریب پہنچے انھوں نے دیکھا ــــ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے اور نجو کا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لئے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی ــــ وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان نجو کا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا ــــ مگر آج ... وہ آدمی لگ رہا تھا ــــ گوشت پوست کا ان جیسا آدمی ــــ یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکّا دیا ــــ مگر نجو کا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا، البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا ــــ

سریندر پرکاش عام طور پر کرداروں کی نفسیات میں اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی افسانہ نگاری اس طرح کی ہے بھی نہیں کہ جس میں نفسیاتی تفتیش کی ضرورت ہو۔ وہ افراد سے زیادہ ماحول اور تاریخ اور تہذیب کی نفسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ "خواب صورت" جیسا افسانہ بھی، جو بظاہر ایک نفسیاتی نکتے پر مبنی ہے، آخری تجزیے کی روشنی میں تہذیب کی نفسیات کا مطالعہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ قبائلی عورت جو مشینی پمپ کا پانی نہیں پیتی، بلکہ پمپ کی پوجا کرتی ہے۔ اور

گندے جوہڑ کا پانی بیتی ہے، افسانے کے متکلم سے زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن خود افسانے کا متکلم ایک پورے اسطور سے منسلک ہے۔ بچپن میں وہ معصوم تھا تو اسے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ جوان ہو کر اس کے خواب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مارگریٹ کو وہ اپنی بہن کہتا اور سمجھتا ہے، لیکن خواب میں وہ اسے کسی اور روپ میں نظر آتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ بچپن کی معصومیت کے زوال اور زیاں کا اسطور بن جاتا ہے۔

"بازگوئی" ہمارے زمانے اور نئے افسانے کا اعلان بھی ہے اور علامت بھی۔ جدید تر افسانہ نگاروں کے لئے ان افسانوں میں کئی سبق پنہاں ہیں اور خود سُریندر پرکاش کا فن اس کتاب میں تابناک بلندی کی منزل پر نظر آتا ہے۔

●———●———●———●———●

شمس الرحمٰن فاروقی

پٹنہ
۲۸ اگست ۱۹۸۷

بازگوئی

صدیوں پرانے اس تاریخی شہر کے عین وسط میں عالمگیر شہرت کے چوراہے پر، بائیں طرف مضبوط اور کھردرے پتھروں کی وہ مستطیل عمارت زمانے سے کھڑی تھی جسے ایک دنیا عجائب گھر کے نام سے جانتی تھی —— عجائب گھر کے بڑے ہال میں لمبے لمبے شوکیس پڑے تھے جن کے اندر ہزاروں برس پرانی تحریروں کے مسودے رکھے تھے۔

میں ان نسخوں کو دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اور میری حیرانی بھی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ عجیب و غریب رسم الخط تھے کہ —— آج ہمارے قلم سے جو تحریر نکلتی ہے، وہ اس انسان کی تحریر سے کتنی مختلف ہے جو ہم سے ان گنت زمانے اُدھر کھڑا ہے۔ یہ ساری تبدیلیاں کتنے انقلابوں کی تیز دھار پر سے چل کر رُونما ہوئی ہوں گی؟

(جب میرے ذہن میں لفظ "انقلاب" آیا تو میں ذرا سہم سا گیا —— میں نے اپنی طرف سے بڑی ہوشیاری برتی اور نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی نے میرے خیال کو بھانپ تو نہیں لیا؟ لیکن میرے قریب اس وقت سوائے عجائب گھر کے اس افسر کے اور کوئی نہ تھا جو مجھے مسودے دکھا رہا تھا اور اسے شاید کسی زندہ چیز، زندہ خیال یا زندہ تحریر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی —— ہاں، اگر آج ہم مر جائیں یا انقلاب کا تصور اُن پرانے مسوّدوں کی طرح زرد اور بھر بھرا ہو جائے تو وہ ہماری میموں کو اور انقلاب کے تصور کے زرد اور بھر بھرے مسودے کو احتیاط اور احترام سے اس عجائب گھر کے کسی شوکیس میں سجا کر رکھ دے گا۔)

ہم دونوں نے اچانک رُک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے سنے آگے بڑھنے لگے —— اس بڑے ہال سے باہر نکلنے والے دروازے کے قریب ایک مربع شکل

اور نسبتاً مختصر شوکیس رکھا تھا جس میں صرف ایک مسودہ پڑا تھا۔
افسر نے کہا: "جناب والا! ایک مسوّدہ یہ بھی ہے کس زبان میں لکھا گیا ہے، آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کئی ماہر لسانیات اپنا سر کھپا چکے ہیں اور صرف کچھ لفظ پہچاننے میں کامیاب ہو سکے ہیں جیسے سوداگر، بچہ، دوشیزہ، شہر پناہ، رقص، نان، بازار۔۔۔ اور صرف یہی اندازہ لگا سکے ہیں کہ یہ کوئی بہت پرانی داستان ہے۔۔۔"
میں اس کی بات غور سے سُن رہا تھا اور میری نظریں مسودے پر جمی ہوئی تھیں۔
مجھے وہ تحریر کچھ جانی پہچانی لگی —— پھر اُس تحریر کے کچھ لفظ تصویروں کی طرح میرے ذہن میں اُبھر آتے —— پھر جیسے صحرا میں کوئی تیز بگولہ اُٹھا —— اور ساری بات آناً فاناً میرے ذہن میں ایک کلی کی طرح چٹک گئی: وہ میری ہی تحریر تھی۔
"یہ تو میری ہی تحریر ہے۔۔۔" میں غیر ارادی طور پر چیخ اُٹھا۔
افسر نے میرے تمتماتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا: "میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ اپنے ورثے کو ہمیں اسی طرح اپنانا چاہیئے۔"
میں قدرے سنبھلا اور مجھے خیال آیا کہ اس تحریر کے بارے میں میرا بیان کئی قسم کی اُلجھنیں پیدا کر سکتا ہے۔ مَیں نے بات کا رُخ بدلا: "بات یہ ہے جناب۔۔۔ میں تھوڑی سی کوشش سے یہ تحریر پڑھ سکتا ہوں۔۔۔ میں اس زبان سے واقف ہوں۔"
"تعجب ہے۔۔۔" اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا: "آپ تو لسانیات کے ماہر نہیں ہیں"
"جی ہاں! میں لسانیات کا ماہر نہیں ہوں لیکن کچھ زبانیں میں جانتا ہوں جو میں نے کسی سے سیکھی یا پڑھی نہیں ہیں۔۔۔ مثلاً میں آپ کو یہ تحریر پڑھ کر سُنا سکتا ہوں۔" میں نے شوکیس میں رکھے ہوئے مسودے کے پہلے صفحے کی ابتدائی سطریں پڑھنا شروع کر دیں:

ابی نی او ——
نعمالِ فِل اجانیر، شہر گرانیل ساحل ——
اُفنادراغیاث آملو۔۔۔

عجائب گھر کا افسر تو گویا چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے تھام لیا۔ اس نے

اپنی پتلون کی جیب میں سے میلا سا رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔ پھر چند لمحوں کے بعد وہ بولا: "آپ . . . آپ نے مجھے زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا دیا ہے جناب والا! یہ ہزاروں سال پُرانی تحریر آپ پانی کی روانی کیطرح پڑھ سکتے ہیں . . . کیا آپ اسکا مطلب بیان فرمائیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟" میں نے جواب دیا اور پھر میں نے ان تین سطروں کا مطلب بتایا جو ابھی میں نے پڑھی تھیں:

یہ ان دنوں کی داستان ہے جب دریائے نیل کے ساحل پر ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر کا نام اُجانیر تھا ـــــ اس شہر کے کھنڈروں میں آج میں اپنا غیاب بجاتا ہُوا گھوم رہا ہوں اور پرانی داستان کھنڈروں کے پتھروں پر کھدی ہوئی ہے . . .

عجائب گھر کے افسر کے گلے میں سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلنے لگیں ـــــ اپنے استعجاب پر بمشکل قابو پانے کے بعد اُس نے پوچھا: "یہ غیاب کیا بلا ہے؟"

"یہ اس زمانے کا ایک ساز تھا جس کی ترقی یافتہ شکل میں آج سارنگی موجود ہے۔" میں نے جواب دیا۔

افسر لپکتا بھاگتا باہر نکل گیا ـــــ اور جب تھوڑی دیر بعد لوٹا، اس کے ساتھ عجائب گھر کے عملہ کے کافی سارے لوگ تھے۔ سب نے مجھے گھیر لیا ـــــ آخر طے یہ ہُوا کہ میں وہ مسودہ سرکاری طور پر گھر لے جاؤں اور اس زبان اور داستان کا عقدہ حل کروں لہٰذا میں وہ نسخہ اپنے گھر لے آیا۔

جب گھر پہنچا تو میں اُداس اور پریشان تھا ـــــ ہزاروں سال پہلے کی اپنی زندگی کا ایک ایک واقعہ میرے دھیان میں آگیا تھا۔

زخم کے ہرا ہونے کا عمل اگر اندر سے دھیرے دھیرے زخم کے کھُل جانے کو کہتے ہیں تو شاید آدمی آہستہ آہستہ سرایت کرتے ہوئے اس درد کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور اگر اچانک زخم پر چوٹ لگے تو درد قابلِ برداشت نہیں ہوتا ـــــ میں اندر ہی اندر اس زخم

پر لگی چوٹ کی وجہ سے بلبلا رہا تھا۔

آج ۱۹۷۸ء ہے اور ابھی سال بھر پہلے ہی ہم ایک زبردست سیاسی انقلاب میں سے گزرے ہیں ـــــ اس ملک کے عوام نے اندرا گاندھی کے طرزِ عمل کے خلاف اپنے غم و غصہ کا بھرپور اظہار کیا اور چند ایک پرانے تجربہ کار سیاست دانوں اور چند ایک نئے خواہش مندوں کے ہاتھ اپنے ملک کی باگ ڈور سونپ دی ـــــ اُن سب نے ایک ساتھ باپو کی سمادھی پر قسم کھائی کہ وہ ملک کی عظمت برقرار رکھیں گے اور نیک معصوم اور غریب عوام کی ایمانداری، نیک نیتی اور سچائی سے خدمت کریں گے۔

اور اُسی دن کی رات نے جب اپنا دامن باپو کی سمادھی پر پھیلایا تو ایک جگنو مالکونی کی جھاڑیوں میں سے جگمگاتا ہوا نکلا۔ سمادھی تک پہنچنے سے پہلے وہ ہزاروں بار جگمگا تھا سمادھی پر پہنچ کر وہ بنا بجھے چمکنے لگا حتیٰ کہ اپنے ہی بدن کی گرمی سے جل کر راکھ ہو گیا ـــــ اگلی صبح صفائی کرمچاریوں نے باسی پھولوں کے ساتھ ساتھ اس کی راکھ بھی سمیٹی اور جمنا کے پانی میں بہا دی۔

اُسی صبح اخباروں میں جو تصویریں اور خبریں چھپی تھیں، ان میں نہ جگنو دکھائی دیا تھا اور نہ ہی اس کی شہادت کی خبر۔

اُجانیر ـــــ اُجانیر ـــــ

صحراؤں میں سے جو کارواں گزر رہے تھے، وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے پکار اٹھتے تھے: ”اُجانیر، اُجانیر“، کہ یا تو لوگوں کا رُخ اجانیر کی طرف ہوتا یا وہ اپنا سامانِ تجارت اُجانیر کی منڈی میں اچھے بھاؤ بیچ کر شادمانی سے لَوٹ رہے ہوتے ـــــ صحرا یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا اور رہ رہ کر بگولے اُٹھتے۔ سورج صحرا کے ذرّے ذرّے میں چمکتا تو لاکھوں کروڑوں سورج آنکھوں کے سامنے ناچ اٹھتے ـــــ دُور سے گزرتے ہوتے کارواں حرکت کرتی ہوئی تصویروں کی طرح محسوس ہوتے۔

انھیں اُڑتے ہوئے بگولوں اور حرکت کرتی تصویروں میں سے اُس روز ایک کارواں دھیرے دھیرے شہر اُجانیر جو ساحلِ نیل پر آباد تھا، کی سمت بڑھ رہا تھا میرِ کارواں

مُلک ایران کا بہت بڑا سوداگر تھا اور تجارتی مال واسباب میں خشک میوے، قالین اور جڑی بوٹیاں لے کر چلا تھا۔

اُس کا نام فرید ابنِ سعید تھا اور اس کی نیک نیتی، ایمانداری اور معاملہ فہمی کے چرچے قرب وجوار میں عام تھے۔ فرید ابنِ سعید جس ملک میں بھی تجارت کے لئے اپنا کارواں لے کر جاتا تھا، وہاں کا حاکم شہر کے دروازے پر اُسے خوش آمدید کہتا۔ اُسے اپنے مُلک میں آزادی سے خرید فروخت کی پوری سہولیت دیتا اور اپنے تاجروں کو اس سے تجارت کا سلیقہ سیکھنے کی تلقین کرتا۔ فرید ابنِ سعید کا کسی ملک میں وارد ہونا نیک فال سمجھا جاتا اور فرید ابنِ سعید سے لین دین کرنا خیر وبرکت کی نشانی۔

ابھی اُجالا بہت دُور تھا۔ سورج نے صحرا کے ذرّوں میں جگائے ہوئے چراغ ایک ایک کر کے بجھا دیے تھے۔ نیل کی رگوں میں بہتا ہُوا چاندی کا سیال کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ کارواں کو رات گزارنے کے لئے پڑاؤ ڈالنے کا حکم ہُوا۔

خیمے تن گئے۔ اونٹوں کو وزن سے آزاد کر دیا گیا فرید ابنِ سعید کا خاص ملازم حقّہ تازہ کر کے لے آیا۔ جیسے جیسے رات بڑھتی جا رہی تھی خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور تھکے ہوئے مسافر اور جانور طعام کے بعد اونگھنے لگے تھے۔

فرید ابنِ سعید کے حقّے میں سے ابھی تمباکو کا ذائقہ ختم نہیں ہُوا تھا اور چلم میں ایک آدھ چنگاری کش لگانے سے ابھی چمک اٹھتی تھی کہ کہیں دُور سے رباب کی آواز سُنائی دی۔

فرید ابنِ سعید کی نیم وا آنکھوں میں جیسے کوندہ سا لپک گیا۔ وہ اُن سُروں سے واقف تھا جو بہت دُور کہیں گونجے تھے۔ کہاں کس نے رباب بجایا ہو گا؟ زمین پر پھیلے ہوئے صحرا کے کون سے حصّے میں؟ اُس نے سوچا اور اس کے کان رباب میں سے آہستہ آہستہ بیدار ہوتے ہوئے نغمے کے لئے بیتاب ہو اُٹھے۔

بہت دیر ہو گئی تو سُر کچھ واضح ہوئے کہ صحرا میں چلنے والی ہوائیں شاید اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھنے کے لئے تھم گئی تھیں۔ وہ غیر واضح نغمہ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس تک پہنچ رہا تھا اور وہ اسکی گمشدہ کڑیاں خود بخود جوڑ رہا تھا۔

"خدایا! تو نے مجھے ہاتھ عنایت فرمائے۔
تیرا شکریہ!
ہاتھوں کو تو نے زنجیریں بنانے کا حکم دیا۔
تیرا شکریہ!
زنجیروں کو تو نے میرے بدن کا زیور بنایا
تیرا شکریہ!
—— لیکن یہ مجھے کون گھسیٹ رہا ہے خدایا؟
یہ کوڑے کیا تیرے حکم سے برسائے جا رہے ہیں؟
—— تو اپنے زیور واپس لے لے اور مجھے
میرے ہاتھ دے دے،
تیرا شکریہ!"

فرید ابن سعید جانتا تھا کہ یہ غلاموں کا ترانہ ہے جو وہ اپنے آقاؤں سے چھپ کر ویرانوں میں جا کر گایا کرتے ہیں اور پھر اُن کے چہرے آنسوؤں سے شرابور ہو جاتے ہیں اور اُن پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ الاؤ کی آخری لکڑی جلنے تک دیوانہ وار رقص کرتے ہیں کہ فرید ابنِ سعید کبھی خود غلام تھا اور اس نے یہ نغمہ اپنے غلام باپ کی آغوش میں بیٹھ کر سُنا تھا اور پھر اپنی توتلی زبان سے آوازوں کے ساتھ اپنی آواز ملا دی تھی:
تیلا ُنکلیا! تیلا نکلیا! تیلا نکلیا!
اور اُسے وہ منظر یاد آیا جب اس نے اپنے ننھے ہاتھ سے اپنے باپ کے چہرے سے آنسو پونچھے تھے۔

"مہاتما گاندھی ہمارے راشٹر پتا تھے، پتاجی؟" میرے بیٹے نے پوچھا جو سامنے زمین پر بیٹھا اپنے اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔
"ہوں... ہاں..." مَیں نے چونک کر جواب دیا اور پھر مسودہ کھنگالنے میں لگ گیا۔

تو پھر اُن کو مار کیوں دیا گیا؟ اُس نے پھر پوچھا۔
میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے بے دھیانی میں کہا: "آپکا شکریہ!"

فرید ابنِ سعید بے تاب ہو اُٹھا۔ اس نے اپنے خاص ملازم کو پکارا: "یوسف!"
"آقا!" کہیں دوسرے خیمے سے یوسف نے ہڑبڑا کر جواب دیا۔ اور پھر تیزی سے لپک کر اپنے مالک کے خیمے میں گھس گیا ـــــ "آقا!" اس نے سر جھکا دیا۔
"یہ نغمہ سُن رہے ہو؟"
یوسف مارے خوف کے کانپ اٹھا اور اس نے بغیر جواب دئے سر جھکا دیا۔
"جواب دو، بے وقوف ڈرو نہیں۔"
"ہاں آقا۔"
"کیا تم آواز کی سمت اندھیرے میں سیدھے جا سکتے ہو؟"
"ہاں آقا۔"
"تو جاؤ۔ اُس مغنّی کو ہمارے پاس لے آؤ اپنا سب سے زیادہ تیز رفتار اونٹ لے جاؤ۔"
یوسف سر جھکائے ہوئے باہر نکل گیا۔ اُس نے جگالی کرتے ہوئے تھکے ہارے اونٹ کو اُٹھایا اور پھر صحرا کے اندھیرے میں گھس گیا۔
"۱۹۴۲ء میں راشٹر پتا نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔ سارا دیش انکی آواز میں آواز مِلا کر چیخ اٹھا: "ہندوستان چھوڑ دو" ـــــ میرا بچہ اپنی کتاب میں سے پڑھ رہا تھا۔

انگریزوں نے رہنماؤں اور دیش بھگتوں کو چُن چُن کر جیلوں میں بند کر دیا۔ سب طرف گولیوں کی آواز گونجنے لگی۔ لاٹھیوں سے بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں کی ہڈیاں توڑی جانے لگیں۔ انگریز حکمراں ہر اُبھرنے والی آواز دبا دینا چاہتے تھے۔

گانے کی آواز کے ساتھ غیاب کی جھنکار صحرا کی خاموشی میں ایک پُر اسرار طلسم کیطرح

آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی جیسے کوئی بوڑھی عورت سِسک رہی ہو اور اپنے جوان بیٹے کی لاش پر بیٹھی بین کر رہی ہو۔

یوسف اونٹ پر بیٹھا آندھی طوفان کی طرح آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا، اس کی ماں نے اُسے آخری بار اپنی چھاتیوں سے دُودھ پلایا تھا اور پھر جی بھر کر روئی تھی اور پھر اس کا ننھا سا جسم دو ہاتھوں پر تھا۔ دو اجنبی ہاتھ، کرخت ہاتھ —— اور اس کی ماں کی ہتھیلی پہ چند سکّے تھے۔

نغمے کی آواز آہستہ آہستہ قریب محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن یہ مجھے کون گھسیٹ رہا ہے خدایا؟

یہ کوڑے کیا تیرے حکم سے برساتے جا رہے ہیں؟

تو اپنے زیور واپس لے لے اور مجھے

میرے ہاتھ دے دے،

تیرا شکریہ!

آواز اب بالکل صاف سُنائی دے رہی تھی۔ یوسف کو یاد آیا، یہ ترانہ ایک بار اُس نے بھی گایا تھا۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا۔ رات بہت اندھیری تھی۔ وہ سب ایک جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ جھاڑیاں اُن کے جسموں پر کوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ اُن سب نے زیور پہن رکھے تھے۔ جب وہ سب تھک کر چُور ہو گئے، سب ایک جگہ ڈھیر کر دئیے گئے تھے۔ اُن کی آنکھیں نیند کی وجہ سے بند ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اُن کے آقا بھی سو گئے تھے اور پہرے دار بھی۔ تب دُور ایک کونے میں کسی نے الاؤ جلا دیا تھا سب ایک ایک کر کے اس الاؤ کے گرد جمع ہو گئے —— اور کسی نے "غیاب" پر نغمہ چھیڑ دیا۔ اور سب بیک آواز گانے لگے تھے: تیرا شکریہ! تیرا شکریہ!

اُسے یاد آیا، آقاؤں کی نیند اُن کے نغمے کی وجہ سے خراب ہوئی تھی اور انھوں نے پہرے داروں کو کوڑے برسانے کا حکم دیا تھا اور پھر سارے میں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔

ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی کانوں کی لوؤں سے ٹکرا رہی تھی اور یوسف اونٹ کو پوری

رفتار سے ہانکے جاتا تھا کہ اچانک اندھیرے میں اُسے محسوس ہُوا کہ وہ اس جگہ پہنچ گیا ہے جہاں ریت کے ٹیلے کافی اونچے ہیں ——— ایک ٹیلے پر ایک سیاہ دھبّہ نظر آرہا ہے۔ اور غیاب کی آواز اُسی دھبّے میں سے اُبھر کر چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ کوئی مری ہوئی آواز میں ترانہ گا رہا ہے مگر الاؤ کہیں نہیں جل رہا ہے۔

تو اپنے زیور واپس لے لے اور مجھے

میرے ہاتھ دے دے،

تیرا شکریہ!

یوسف پکار اُٹھا: "مغنّی!"

آواز سناٹے میں گونجی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ یوسف نے اپنے اونٹ کا رُخ ٹیلے کی طرف کر دیا اور آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ وہاں پہنچ گیا جہاں دھبّہ تھا۔ اس نے پھر آواز دی: "مغنّی!"

نہ دھبّے میں کوئی حرکت ہوئی نہ دھبّے سے کوئی آواز نکلی۔ اس نے اونٹ کو وہیں بٹھا دیا۔ نیچے اُترا اور قریب جا کر اس نے دیکھا، ایک نیم مردہ شخص ہاتھ میں غیاب لیے پڑا ہے۔ اسکے جسم میں کوئی حرکت نہیں، صرف چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں، ہونٹوں سے ترانہ اُبل رہا ہے اور ہاتھ اپنے آپ ہی غیاب کے تاروں پر گرز بھرا رہے ہیں۔

تیرا شکریہ! تیرا شکریہ!

یوسف نے مغنّی کو اونٹ پر لادا کہ مغنّی اس کی کسی بات کا جواب دینے کے قابل نہ تھا اور اس کا جسم بھی حرکت کرنے سے قاصر تھا اور پھر یوسف اپنے خیموں کی طرف روانہ ہُوا۔

فرید ابن سعید اپنے خیمے میں اس کا منتظر تھا۔ اس کے حقّے میں آخری چنگاری بھی بجھ چکی تھی اور تمباکو کا ذائقہ کیسلے غبار میں بدل چکا تھا۔

یوسف نے مغنّی کو اس کے سامنے لا پٹکا اور اس کا غیاب اس کے قریب رکھ کر کھڑا ہانپنے لگا۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ فرید ابنِ سعید نے اپنی چھاگل میں سے مغنّی کے چہرے

بر پانی ٹپکایا تو اس کے سوکھے پپڑیوں جمے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور وہ قطرہ قطرہ پانی پینے لگا، مگر اسے ہوش پھر بھی نہ آیا۔ تب فرید ابنِ سعید نے یوسف کو اشارہ کیا کہ وہ طبیب کو بلا لائے فوراً ہی آنکھیں ملتا ہوا طبیب حاضر ہوا اور اس نے سو جتنوں سے مغنّی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اور جب مغنّی نے آنکھیں کھول دیں تو سب کے دل کھل اُٹھے اور چہروں پر رونق آ گئی۔ فرید ابنِ سعید نے خدا کے آگے ہاتھ پھیلا کر دعا پڑھی :

خدایا تیرا شکریہ !

ایک رات ایک دن پڑاؤ رہا۔ آدمی اور جانور تازہ دم نظر آنے لگے۔ مغنّی کھانے پینے کے قابل ہو چکا تھا کہ کارواں روانہ ہوا۔ ایک اونٹ پر اسے محمل میں لٹا دیا گیا۔ میرِ کارواں بڑا رحم دل تھا اور شہر اُجانیر ابھی بہت دُور تھا جہاں نیل میں چاندی کا سیال دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا۔

اُجانیر کا بوڑھا حاکم بڑا نیک دل انسان تھا۔ اُس کے انتظام اور انصاف پسندی کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اُجانیر کے بازار کی رونق اسی کے دَم سے تھی جہاں سوداگروں کا سامان اور خریداروں کی دولت بالکل محفوظ تھی۔ سرائے مُسافروں سے بھری رہتی اور طعام خانوں سے پکوانوں کی خوشبوئیں اُڑتی رہتیں۔ سپاہ لوگوں کی خدمت کے لئے تھی اور جیل خانے عرصہ سے مرمّت نہیں کروائے گئے تھے۔

بوڑھا حاکم بازفادی کبھی کبھار اپنی جوان ملکہ شبروزی کے ساتھ اپنے محل سے نکل کر بازار کا نظارہ کرنے جاتا تو رعایا کی نظریں احترام سے جُھک جاتیں۔ اُس کی سپاہ کے جاں باز اس کے اشارے پر جان دینے کے لئے تیار رہتے اور پسینے پر خون بہانے کا فرض ادا کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔

بازفادی بڑا سمجھ دار تھا۔ وہ مال خریدنے اور بیچنے والوں سے تھوڑا تھوڑا محصول وصول کرتا ــــ اور آرام سے زندگی گزارتا۔ اس کا بیوپار اس کی نیکی کی شہرت پر منحصر تھا اور اس کے دن رات جوان ملکہ شبروزی کی آغوش میں چین سے کٹ رہے تھے ــــ کہ

—— کہ اچانک ایک رات کسی نے اُسے قتل کر دیا۔ اس رات بھی وہ شبر وزی کے برہنہ جسم کو اپنے بوڑھے ہونٹوں سے چاٹ رہا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور صبح اُس کی لاش خون میں لت پت پائی گئی۔

اُس کے وزرا نے اتفاق رائے سے ملکہ کو اپنا نیا حاکم تسلیم کر لیا اور کاروبار معمول کے مطابق چلنے لگا۔ بازفادی کا ایک مجسمہ شہر کے چوک میں نصب کر دیا گیا۔

فرید ابنِ سعید اجانیر میں واقع ہونے والی اس تبدیلی سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اُس کا کارواں تیز رفتاری سے صحرا کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک رات پھر پڑاؤ پڑا۔ مغنّی اب بالکل بھلا چنگا تھا۔ الاؤ جلایا گیا اور اس کے گرد سب اکٹھا ہوئے اور اس نے نغمہ الاپا :

جب صحرا تپتے ہیں ، تیری رحمتیں کہاں جاتی ہیں۔

اللہ ہُو !

جب قزاق کارواں لوٹتے ہیں ، تیرا انصاف کہاں جاتا ہے ؟

اللہ ہُو !

جب پکے پھلوں میں کیڑا پڑتا ہے ، تیری قدرت کہاں جاتی ہے ؟

اللہ ہُو !

جب ننگے بدنوں پر کوڑے برستے ہیں ، تیری شفقت کہاں جاتی ہے ؟

اللہ ہُو !

جب اونٹ کھڑے کھڑے دم توڑ دیتے ہیں اور اسباب لاوارث ہو جاتا ہے تیرے مددگار ہاتھ کہاں جاتے ہیں ؟

اللہ ہُو !

جب تیری پرستش کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ کاٹ دئے جاتے ہیں۔ تیری آنکھ کے آنسو کہاں جاتے ہیں ؟

اور پھر سب ایک ساتھ پکار اُٹھے: اللہ ہو، اللہ ہو! سب پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور سب بے اختیار رقص کرنے لگے۔ فرید ابنِ سعید کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو کسی ننھے سے ہاتھ نے پونچھا اور الاؤ کی آخری لکڑی جلنے تک رقص جاری رہا۔ یہ منظر بڑا دل گداز تھا۔

صبح جب کارواں روانہ ہونے لگا تو مغنی جس کا نام تلقارمس تھا، مالامال کر دیا گیا۔ اسے ایک اُونٹ، قالین اور دوسرا تجارت کا سامان انعام میں دیا گیا اور اسے ایک الگ بیوپاری کی حیثیت سے قافلہ میں داخل کر لیا گیا اور پھر کارواں اُجانبر کی طرف بڑھا۔

اپنے اونٹ کی مہار پکڑے ہوتے تلقارمس نے پلٹ کر دیکھا۔ اونٹ مال و اسباب سے لدا ہوا سر اُٹھائے بڑے انداز سے چل رہا تھا۔ ایکا ایکی تلقارمس کو اپنے قدم وزنی محسوس ہوتے جیسے زنجیر سے وزن باندھ کر اس کے پاؤں کو جکڑ دیا گیا ہو لیکن بظاہر وہاں کچھ نہ تھا وہ اس احساس سے حیران اور خوفزدہ سا ہوا۔ اور سر جھکائے قافلے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

سارا اُجانبر نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارے چراغ بجھ چکے تھے۔ بازار میں سے اونٹوں کی جگالی اور مسافروں کے خراٹوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

محل میں حرم کی قندیلیں ابھی روشن تھیں۔ اور ملکہ شبر وزی اپنے بستر پر برہنہ لیٹی ہوئی طلائی جام سے شراب کا ایک ایک گھونٹ پی رہی تھی۔

اندھیری غلام گردش میں ایک سایہ رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ بڑا پُراسرار لگ رہا تھا جیسے کوئی بدرُوح اپنے منحوس پر پھڑپھڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ تیر رہی ہو۔

وہ حرم کے دروازے پر جا کر رُک گیا۔

پہرے دار گشت لگا کر جا چکے تھے اور خادماؤں نے سائے کو دیکھ کر اونگھنا شروع کر دیا تھا۔ جب اس نے دروازے پر ذرا سا دباؤ ڈال کر پٹ اندر کو دھکیلا تو اندر جلنے والی قندیلوں کی روشنی میں اُس کا سراپا جگمگا اُٹھا۔

وہ اُجانیر کی سپاہ کا افسر اعلیٰ اجفیل تھا۔ اُس نے حرم میں داخل ہو کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا اور آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ تب تک ملکہ شبر وزی نے اپنی دونوں باہیں اُس کی طرف وا کر دی تھیں اور اُس کے ہونٹ دعوتِ عیش دے رہے تھے سپہ سالار اجفیل نے پلنگ تک پہنچتے پہنچتے اپنے خوبصورت گٹھے ہوئے جسم کو لباس سے آزاد کر دیا اور پھر اپنے ہونٹ ملکہ کے ہونٹوں پر جما دیے کسی غیبی ہاتھ نے قندیل بجھا دی۔

"بڑی دلچسپ داستان ہے۔ کس نے لکھی ہے؟ تم نے؟" میری بیوی نے پوچھا۔

بچّے سب اسکول جا چکے تھے۔ میں بیٹھا مسودے سے سر کھپا رہا تھا اور میری بیوی سامنے بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ ہم گھر میں بالکل اکیلے تھے۔

"نہیں!" میں نے چونک کر جواب دیا: "داستان بہت پُرانی ہے۔ کسی نامعلوم زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ میں تو صرف اُسے دُہرا رہا ہوں۔"

"ہزاروں سال گزر گئے، زندگی ویسی ہی چل رہی ہے! وہی سازشیں، وہی قتل، وہی اندھیروں میں حرم کی طرف سفر کرتے ہوئے سائے..." میری بیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بنیے کا ملازم بِل لیے کھڑا تھا۔

اُجانیر کا اونچا دروازہ چاندنی میں دُور سے یوں نظر آ رہا تھا جیسے کوئی فرشتہ پر پھیلائے کھڑا ہو۔ قافلے کے لوگوں نے دروازے کی اوپری محراب میں سے چاند مسکراتا ہوا دیکھا۔ یہ نیک فال سمجھا جاتا تھا۔ سب کے چہرے شادمانی سے کھِل گئے اور تھکے ہوئے قدم اپنے آپ تیز ہو اُٹھے۔ منزل سامنے نظر آ رہی تھی ——— نیل شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ دوسری طرف بہتا تھا۔

ابھی آسمان پر چند ستارے باقی تھے کہ فرید ابنِ سعید کا کارواں شہر کے بڑے دروازے پر آ رُکا۔ اونٹوں کو سامان سمیت ہی بٹھا دیا گیا اور قافلے کے لوگ شہر کی فصیل کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر سُستانے لگے۔ سب کو صبح کا انتظار تھا ——— جب بازفادی رسم کے مطابق قافلے کو

خوش آمدید کہنے آئے گا، تحائف کا تبادلہ ہوگا۔ فریدابنِ سعید خیر و برکت کی دُعا مانگ کر قافلے کو اندر داخل ہونے کا حکم دے گا۔ مال و اسباب سرکاری گودام میں رکھا جائے گا تاکہ محفوظ رہے اور قافلے کے لوگ دریائے نیل میں غسل کے لیے کوچ کر جائیں گے ـــــ یہ منظر سب کی نظر میں گھوم گیا سوائے نلقارس کے کہ اس کے لیے یہ زندگی کا پہلا سفر تھا اور پھر اُس کے قدم وزنی بھی تھے۔

رسم کے مطابق فجر کو ملکہ شبر وزی اپنے خاوند کی جگہ دُنیا کے سب سے بڑے تجارتی قافلے کو خوش آمدید کہنے کے لیے دروازے تک آئی۔ اُس کے پیچھے سارے شہر کی خلقت تھی اور اُس کے ہم قدم سپہ سالار جفیل اپنی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھے موجود تھا۔ وزرا نے بڑے دروازے کے دونوں طرف زیتون کا تیل ٹپکایا اور فریدابنِ سعید پر زر رفتگی کے پھولوں کی بارش کر دی۔ سب نے خوشی کے نعرے لگائے اس سے پیشتر کہ میرِ کارواں دروازے میں داخل ہو، اس نے اپنی جھولی میں سے ہیروں کا ایک ہار نکالا اور ملکہ شبر وزی کے قریب جا کر تعظیم سے سر جھکاتے ہوئے کہا: قابلِ احترام ملکہ! اجازت ہو! میں یہ تحفہ اپنے دیرینہ دوست شاہ باز فادی کے لیے لایا تھا۔ افسوس، اب وہ نہیں رہے . . . یہ ہار آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے مسرت بھی ہو رہی ہے اور شاہ کی بے وقت موت پر گہرا رنج بھی . . . ! اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ہیروں کا قیمتی ہار ملکہ کے گلے میں ڈالنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے۔ ملکہ نے بھی اپنے سر کو تھوڑا سا جھکایا ـــــ اس سے پیشتر کہ اُس کے ہاتھ ملکہ کی پیشانی تک بھی پہنچ پاتے، سپہ سالار جفیل نے تلوار کو میان میں سے کھینچا اور تلوار کی نوک پر ہار لے لیا۔ ہار تلوار کی تیز دھار پر سے پھسلتا ہُوا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

فریدابنِ سعید نے حیرانی اور فکرمندی سے جفیل کے چہرے پر دیکھا۔ وہاں بالکل سپاٹ مسکراہٹ تھی۔ پھر اُس کی نظر ملکہ شبر وزی کے چہرے پر جم گئی۔ وہاں بھی سپاٹ مسکراہٹ تھی

اچانک جفیل کی آواز ابھری: "امیر فریدابنِ سعید! شاہ باز فادی کے عہد میں جس طرح یہ تلوار تمہارے مال و متاع کی حفاظت کی ضمانت تھی، اسی طرح ملکہ شبر وزی کے زمانے میں بھی یہ تلوار تمہاری حفاظت کی ضمانت ہے۔"

فرید ابنِ سعید کے ذہن پر ایک خیال ہلکے سے بادل کی طرح چھا گیا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر اپنے قافلے والوں کو شہر کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

ملکہ اور اُس کے اہل کاروں نے قافلے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ شہر کے اندر کی بھیڑ اور شہر کے باہر کی بھیڑ ایک دوسرے میں بالکل گھل مل گئی۔

فرید ابنِ سعید کے کارواں کے اُجانیر پہنچنے کی خبر قرب و جوار میں پھیل چکی تھی اور ارد گرد کی سلطنتوں کے بیوپاری پہلے ہی سے اپنا مال و اسباب لے کر اُجانیر پہنچ چکے تھے۔ سرائے میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ طعام خانے میں ایک ایک نان کے لئے چھینا جھپٹی ہونے لگی تھی اور اونٹوں کے چارے کے لئے لوگ مال خانے کے باہر کھڑے چلّانے لگے تھے۔

دریائے نیل کے چاندی جیسے سیّال میں انسانی جسموں کا میلہ سا لگ گیا۔ مہینوں کی گرد، دھول اور میل دھوتا ہوا پانی گہری سنجیدگی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے کنارے بندھی کشتیاں حیرانی سے یہ منظر دیکھتی ہوئی خاموش کھڑی تھیں کہ اب اُن کی جھولیں مال و اسباب سے بھر جائیں گی اور وہ اپنے وطنوں کو روانہ ہوں گی۔

بازاروں میں سے گزرتے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے اپنے سفر کی صعوبتوں کی داستان بیان کر رہے تھے۔ پچھلی ملاقات اور اِس ملاقات کے درمیان جو وقت تھا اُس میں کیا کمایا کیا کھویا، بتایا جا رہا تھا۔ کہیں کوئی تکان۔ کہیں کوئی فکر کا نشان کسی کے چہرے پر نہ تھا ——

مگر فرید ابنِ سعید اپنے کمرے میں قالین پر بیٹھا ہُوا حقّہ گڑ گڑاتا ہُوا کسی گہری فکر میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اس کا خاص ملازم یوسف بڑی تندہی سے اُس کی خدمت بجالانے کو تیار کھڑا تھا۔

کل جمعہ کا مبارک دن ہے اور وقت کا سب سے بڑا بازار لگنے جا رہا ہے۔ تلقارس جو ایک مغنّی تھا، کل زندگی میں پہلی دفعہ ایک بیوپاری کی حیثیت سے انعام میں ملے ہوئے قالین، خشک میوے اور جڑی بوٹیاں لے کر بازار میں کھڑا ہوگا —— وہ اندر ہی اندر کافی بے چین تھا۔

سورج نیل کے سیّال میں دھیرے دھیرے ڈوبنے لگا اور چاندی کا سیّال سونے کے رنگ میں رنگ کر سنہری ہو گیا —— فرید ابنِ سعید نے جب دیکھا کہ رات نے ہر چیز پر اپنا طلسم

پھونک دیا ہے تو یوسف کو اشارے سے پاس بلایا اور کہا: "عابد سے جا کر کہو، فرید ابنِ سعید نے سلام کہا ہے۔"

یوسف سر کی جنبش سے احترام کا اظہار کرتے ہوئے باہر نکل گیا ـــــ سرائے سے باہر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا، تلقارمس اپنے غیاب پر بے خیالی میں ڈھیرے ڈھیرے گز پھرا رہا ہے۔

عابد کہنے کو تو حیوانوں کا طبیب تھا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا ـــــ فرید ابنِ سعید اور وہ دونوں اکھٹے ہی ایک بازار میں نیلام ہوتے تھے اور پھر اُن کے آقا نے اُنھیں ایک ساتھ ہی آزاد کیا تھا اور اپنا تجارت کا سامان فرید ابنِ سعید کو اور اپنا طب کا علم عابد کو دے کر خدا کو پیارا ہُوا تھا۔ عابد کے باپ کا کسی کو کچھ علم نہ تھا، اس لیے وہ ایک ہی نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ بادشاہ بازفادی کے منظورِ نظروں میں سے تھا اور اکثر چوسر کا کھیل شاہی محل میں جا کر کھیلا کرتا تھا۔ بازفادی کے اونٹوں، گھوڑوں، خچروں اور دودھ دینے والی بھیڑوں کی صحت کی ذمہ داری بھی اُس پر تھی۔ وہ اتنا ایماندار تھا کہ اکثر تاجر اُس کے پاس اپنا فالتو سامان اور نقدی رکھ جایا کرتے تھے اور جب وہ دوبارہ آتے، انھیں تمام چیزیں صحیح و سلامت ملتیں۔ عابد مورخ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اُس کے پاس اس بات کا اندراج موجود رہتا کہ کب کون آیا اور کون سا اہم واقعہ کب پیش آیا۔

عابد بیشتر فرید ابنِ سعید کو شہر کے دروازے پر ملا کرتا تھا، لیکن اس بار ـــــ؟ اور یہی ایک خیال رہ رہ کر فرید ابنِ سعید کو ستا رہا تھا۔

جہاں شہر کی چہار دیواری ختم ہوتی تھی، وہیں سے کھجور کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ اُس کے بعد وسیع چراگاہ تھی جس کے وسط میں ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے پہلو میں گرم پانی کا چشمہ تھا۔ اسی چشمے کے کنارے ٹیلے کی آغوش میں عابد کا مکان تھا۔ مٹی کی اینٹوں سے دیواریں کھڑی کی گئی تھیں اور محرابوں پر چھت ڈالی گئی تھی۔

یوسف نے جنگل پار کر کے چراگاہ میں قدم رکھا اور دُور چاندنی میں نظر آنے والے مکان کی طرف دیکھا۔ اسے کسی جھروکے میں روشنی دکھائی نہ دی۔ اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی

فرید ابنِ سعید کے ذہن پر ایک خیال ہلکے سے بادل کی طرح چھا گیا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر اپنے قافلے والوں کو شہر کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

ملکہ اور اُس کے اہل کاروں نے قافلے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ شہر کے اندر کی بھیڑ اور شہر کے باہر کی بھیڑ ایک دوسرے میں بالکل گھل مل گئی۔

فرید ابنِ سعید کے کارواں کے اُجانیر پہنچنے کی خبر قرب و جوار میں پھیل چکی تھی اور ارد گرد کی سلطنتوں کے بیوپاری پہلے ہی سے اپنا مال واسباب لے کر اُجانیر پہنچ چکے تھے۔ سرائے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ طعام خانے میں ایک ایک نان کے لئے چھینا جھپٹی ہونے لگی تھی اور اونٹوں کے چارے کے لئے لوگ مال خانے کے باہر کھڑے چلّانے لگے تھے۔

دریائے نیل کے چاندی جیسے سیّال میں انسانی جسموں کا میلہ سا لگ گیا۔ مہینوں کی گرد، دھول اور میل دھوتا ہوا پانی گہری سنجیدگی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے کنارے بندھی کشتیاں حیرانی سے یہ منظر دیکھتی ہوئی خاموش کھڑی تھیں کہ اب اُن کی جھولیں مال واسباب سے بھر جائیں گی اور وہ اپنے وطنوں کو روانہ ہوں گی۔

بازاروں میں سے گزرتے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے اپنے سفر کی صعوبتوں کی داستان بیان کر رہے تھے۔ پچھلی ملاقات اور اس ملاقات کے درمیان جو وقت تھا اُس میں کیا کمایا کیا کھویا، بتایا جا رہا تھا۔ کہیں کوئی تکان۔ کہیں کوئی فکر کا نشان کسی کے چہرے پر نہ تھا —— مگر فرید ابنِ سعید اپنے کمرے میں قالین پر بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑاتا ہوا کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا خاص ملازم یوسف بڑی تندہی سے اُس کی خدمت بجا لانے کو تیار کھڑا تھا۔

کل جمعہ کا مبارک دن ہے اور روقت کا سب سے بڑا بازار لگنے جا رہا ہے۔ تلقارس جو ایک مغنی تھا، کل زندگی میں پہلی دفعہ ایک بیوپاری کی حیثیت سے انعام میں ملے ہوئے قالین، خشک میوے اور جڑی بوٹیاں لے کر بازار میں کھڑا ہوگا —— وہ اندر ہی اندر کافی بے چین تھا۔

سورج نیل کے سیّال میں دھیرے دھیرے ڈوبنے لگا اور چاندی کا سیّال سونے کے رنگ میں رنگ کر سنہری ہو گیا —— فرید ابنِ سعید نے جب دیکھا کہ رات نے ہر چیز پر اپنا طلسم

پھونک دیا ہے تو یوسف کو اشارے سے پاس بلایا اور کہا: "عابد سے جاکر کہو، فرید ابنِ سعید نے سلام کہا ہے۔"

یوسف سر کی جنبش سے احترام کا اظہار کرتے ہوئے باہر نکل گیا ـــــ سرائے سے باہر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا، تلقارمس اپنے غیاب پر بے خیالی میں دھیرے دھیرے گز پھرا رہا ہے۔

عابد کہنے کو تو حیوانوں کا طبیب تھا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا ـــــ فرید ابنِ سعید اور وہ دونوں اکھٹے ہی ایک بازار میں نیلام ہوئے تھے اور پھر اُن کے آقا نے اُنھیں ایک ساتھ ہی آزاد کیا تھا اور اپنا تجارت کا سامان فرید ابنِ سعید کو اور اپنا طب کا علم عابد کو دے کر خدا کو پیارا ہُوا تھا۔ عابد کے باپ کا کسی کو کچھ علم نہ تھا، اس لیے وہ ایک ہی نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ بادشاہ بازفادی کے منظورِ نظروں میں سے تھا اور اکثر چوسر کا کھیل شاہی محل میں جاکر کھیلا کرتا تھا۔ بازفادی کے اونٹوں، گھوڑوں، خچروں اور دودھ دینے والی بھیڑوں کی صحت کی ذمہ داری بھی اُس پر تھی۔ وہ اتنا ایماندار تھا کہ کئی تاجر اُس کے پاس اپنا فالتو سامان اور نقدی رکھ جایا کرتے تھے اور جب وہ دوبارہ آتے، انھیں تمام چیزیں صحیح و سلامت ملتیں۔ عابد مورّخ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اُس کے پاس اس بات کا اندراج موجود رہتا کہ کب کون آیا اور کون سا اہم واقعہ کب پیش آیا۔

عابد بیشتر فرید ابنِ سعید کو شہر کے دروازے پر ملا کرتا تھا لیکن اس بار ـــــ؟ اور یہی ایک خیال رہ رہ کر فرید ابنِ سعید کو ستا رہا تھا۔

جہاں شہر کی چہار دیواری ختم ہوتی تھی، وہیں سے کھجور کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ اُس کے بعد وسیع چراگاہ تھی جس کے وسط میں ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے پہلو میں گرم پانی کا چشمہ تھا۔ اسی چشمے کے کنارے ٹیلے کی آغوش میں عابد کا مکان تھا۔ مٹی کی اینٹوں سے دیواریں کھڑی کی گئی تھیں اور محرابوں پر چھت ڈالی گئی تھی۔

یوسف نے جنگل پار کر کے چراگاہ میں قدم رکھا اور دُور چاندنی میں نظر آنے والے مکان کی طرف دیکھا۔ اسے کسی جھروکے میں روشنی دکھائی نہ دی۔ اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی

طرف دیکھا۔ ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے اور چاند محوِ سفر تھا۔

"وہاں روشنی کیوں نہیں ہے؟" یوسف نے سوچا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔

عابد کا مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ کسی جاندار کے سانس لینے تک کی آواز نہ آرہی تھی۔ یوسف نے مکان کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اسے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ ایک چکر لگا کر پھر صدر دروازے پر آگیا اور بے اختیار چلّا اٹھا: "اے حکیم . . . !"

شیشم کے ایک بڑے پیڑ پر سے ایک چیل چیختی ہوئی اڑی اور آسمان کی وسعت میں گم ہوگئی۔ یوسف کی چیخ سے نیل کے ساحل پر بیٹھی ہوئی ابابیلیں "چیاں چیاں" کرتی ہوئی نیل کے اوپر طواف کرنے لگیں اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اُس خاموشی اور تاریکی میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا یوسف شہر کی سرائے کی طرف لوٹ آیا۔

فرید ابنِ سعید نے سب حال سُنا اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

یوسف نے آقا کو فکرمند دیکھ کر کہا: "حقّہ تازہ کر کے حاضر کروں؟"

"نہیں . . . " فرید ابنِ سعید نے پلٹ کر اسکی طرف دیکھا: "اپنے سب بیوپاریوں سے کہدو کہ کل بازار نہیں لگے گا . . . اور مغنّی سے کہو، غیاب پر غلاموں کا ترانہ بجاتے اور سرائے کے صحن میں الاؤ جلا دو . . . "

شاہی محل کے ایک کمرے میں قندیلیں روشن تھیں اور وسطی ہال میں فانوس اپنی نورانی کرنیں بکھیر رہے تھے۔ ایک بہت ہی خاص اجلاس بلایا گیا تھا۔ جس میں تمام وزرا اور مشیر مدعو تھے۔ شاہی نعمت خانے سے بھنتے ہوئے گوشت کی سگندھ اُٹھ رہی تھی اور بڑی میز پر شہتوت کی شراب کی صراحیاں سجی تھیں۔ تمام لوگ اجلاس کی غایت سے ناواقف تھے اور اسے محض شاہی دعوت سمجھ کر خوشی خوشی نا و نوش میں غرق تھے۔

ملکہ تخت پر بیٹھی سب کو مسکراہٹیں بانٹ رہی تھی اور قریب ہی بیٹھا سپہ سالار جفیل ملکہ کے ساتھ سرگوشی میں گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے اُمرا و وزرا پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ——— تب کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ میں ابھی

تک ننگی تلوار ہے اور اُس کے گلے میں فرید ابنِ سعید کا پیش کیا ہُوا ہیروں کا ہار ہے۔
اُسے کھڑا دیکھ کر سب طرف سناٹا چھا گیا۔ اس نے ایک بار پھر ملکہ شبرزی کے چہرے پر اپنی نظر ڈالی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور ایک بامعنی مسکراہٹ کا تبادلہ ہُوا جفیل نے کہنا شروع کیا: ”معززین، اس خاص اجلاس میں آنے کی تکلیف آپ لوگوں کو اس لیے دی گئی ہے کہ ایک بہت ہی اہم معاملے میں آپ لوگوں کی رائے کی ضرورت آن پڑی ہے ...“ وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا، پھر متحیّر چہروں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کہنے لگا:
”کل وقت کا سب سے بڑا بازار ہمارے شہر کی چہار دیواری کے اندر لگنے جا رہا ہے جس میں قریب و دُور کے سینکڑوں تاجر جامن کی گٹھلیوں سے لے کر غلاموں تک کی خرید و فروخت کریں گے اور جھولیاں بھر کر منافع کمائیں گے۔ اُجانیر دُنیا بھر میں (جتنی دُنیا دریافت ہو چکی ہے) اپنے وقت کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ یہاں لوگوں کی عزّت، مال و اسباب اور دولت، سب کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور تاجر یہاں بلا خوف و خطر لین دین کرتے ہیں ... ہمارے آنجہانی بادشاہ حضرت بازفادی کے وقت میں دو باتیں رائج تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہر مال کی فروخت پر ایک فی صدی محصول لیا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ اگر کسی تاجر کو نقصان ہو جاتا تھا تو اسے سرکاری خزانے سے ایک برس کے لئے بلا سُود قرض مل جاتا تھا۔ ایسے تاجر اور اُس کے ضامنوں پر لازم تھا کہ اگلے برس جب وہ آئیں تو قرض کی رقم لوٹا دیں، بصورتِ دیگر اُسے اور اس کے ضامنوں کو بازار میں خرید و فروخت کی اجازت نہ ملتی تھی ... محترمہ ملکہ اس قانون کا پورا پورا احترام کرتی ہیں اور تاجروں کو زیادہ سے زیادہ سہولت دینے کے حق میں ہیں۔ لیکن وقت بدل گیا ہے۔ سرکاری اخراجات بڑھ جانے کی وجہ سے خزانے پر کچھ زیادہ ہی بوجھ آن پڑا ہے۔ اُجانیر اپنے محدود ذرائع سے اس بوجھ کو برداشت کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ لہٰذا ملکہ آپ لوگوں کے سامنے ایک تجویز رکھتی ہیں کہ خرید و فروخت پر محصول تو ایک فی صدی ہی رہے لیکن خرید کرنے والے اور فروخت کرنے والے دونوں پر محصول لازم قرار دیا جائے ... اور سرکاری خزانے میں سے دیے جانے والے قرض پر ایک فی صدی سُود وصول کیا جائے۔ تجویز آپ کے سامنے ہے اور آپ سب حضرات کی منظوری لازمی ہے کہ یہی طریقہ

اس ملک میں رائج ہے . . .“ چند لمحوں بعد جفیل نے اپنی ننگی تلوار فضا میں اٹھاتے ہوئے کہا
”آپ سب صاحبِ فہم لوگ ہیں۔ وقت کے تقاضے سے بخوبی واقف ہیں۔ ملکہ اُمید کرتی ہیں کہ
آپ اُن کی تجویز سے اتفاق کریں گے ۔“

سب طرف سنّاٹا چھا گیا۔ اُمرا و وزرا نے سر جُھکا لیے۔ سب طرف خوف سا طاری نظر
آنے لگا۔ کسی نے زبان تک نہ کھولی۔

”. . . تو اس کا مطلب ہے ، سب کو ملکہ کی تجویز منظور ہے . . .“ اُس نے مُسکراتے ہوئے
اور پھر تلوار بغل میں دبا کر تالیاں بجائیں۔ سارے دربار میں اُس کی تالیوں کی گونج سنائی دے
رہی تھی اور ملکہ مُسکراتے ہوئے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اہلمد کو حکم دیا گیا کہ وہ شاہی تجویز کی
منظوری پر سب کے دستخط کروالے —— اور کانپتے ہوئے ڈھیروں ہاتھوں نے قلم تھام
کر باری باری دستخط کر دیے۔

جس وقت محل میں شاہی تجویز پر منظوری کے دستخط ہو رہے تھے، شہرِ اُجانیر کی سب سے
بڑی اور سب سے عالیشان سرائے کے صحن میں الاؤ کے گرد لوگ دیوانہ وار ناچتے ہوئے غلاموں
کا ترانہ گا رہے تھے ۔

تیرا شکریہ !
تیرا شکریہ !

اگلی صبح ویران اور بے رونق بازار میں سرکاری منادسیہ کی معیت میں داخل ہُوا اور
سرکاری اعلان پڑھ کر سُنانے لگا :

”مُلک خدا کا حُکم ملکہ کا : اطلاع برائے ہر خاص وعام۔ حاکمہ مقامی اور غیر مقامی تاجرین کو
خوش آمدید کہتی ہے۔ اُن کے جان ومال کی حفاظت کا یقین دلاتی ہے —— یہ اعلان بھی کیا
جاتا ہے کہ آج سے اشیا کی خرید فروخت ، دونوں پر دونوں طرف سے ایک ایک فی صد محصول
وصُول کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ نقصان اٹھانے والے بیوپاریوں کو سرکاری خزانے سے
حسبِ سابق قرض بھی دیا جائے گا لیکن اب قرض کی رقم پر محض ایک فی صد سُود وصول کیا جائے
گا —— ملکہ کی نیک خواہشات خدا کے سب بندوں کو پیش کی جاتی ہیں۔“

لوگوں نے یہ اعلان بازار میں کھڑے ہو کر نہیں، اپنے گھروں اور سرائے کے بلند دروازوں کے پیچھے کھڑے ہو کر سُنا ـــــ اور سرکاری منادی لوگوں کی بے توجہی سے بددل ہو کر جلد ہی واپس اپنے گھر لوٹ گیا۔

سُورج کی روشنی محل کے گنبدوں پر پوری طرح پھیل گئی تھی جب ملکہ اور سپہ سالار شب باشی کے بعد اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ دونوں نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے برہنہ جسموں پر پھرائے اور صبح کا پہلا بوسہ ایک دوسرے کے ہونٹوں پر ثبت کیا۔

غسل تیار تھا۔ دونوں نے خوب مَل مَل کر ایک دوسرے کے جسم سے، ایک دوسرے کی رطوبت اُتاری اور تازہ دم ہو کر شاہی لباس زیب تن کیا اور ناشتہ بازار کی طرف کے جھروکے پہ لگوایا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر تازہ پھلوں کا رس پینے لگے۔ اچانک اُن کی نظر بازار کی طرف اُٹھ گئی۔ دونوں بھونچکے رہ گئے۔ بازار میں جہاں آج کھوے سے کھوا چھلنا چاہیے تھا، کوئی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دونوں ناشتہ نہ کر سکے۔ کھانے پینے کا سامان دسترخوان پر ویسے کا ویسا پڑا رہ گیا ـــــ دونوں جب دسترخوان سے اُٹھے، خادمائیں دسترخوان پر بھوکی کُتیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

سپہ سالار کے دفتر میں مُخبر پہلے ہی سے کھڑے سپہ سالار کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا: محصول بڑھائے جانے کی خبر سے پہلے ہی فرید ابنِ سعید نے بازار نہ لگانے کا حکم دے دیا تھا... رات بڑی سرائے کے صحن میں الاؤ کے گرد غلاموں کا ترانہ بھی گایا گیا تھا۔ سب ساری رات ناچتے رہے تھے اور صبح ہونے تک تھک ہار کر سو گئے تھے...

سپہ سالار جعفیل کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر جا کر ٹِک گیا ـــــ اُس نے داروغۂ شہر کو حکم دیا کہ وہ فرید ابنِ سعید کو پکڑ کر ملکہ کے سامنے پیش کرے۔

فرید ابنِ سعید (اکیلا نہیں) اپنے سولہ جانبازوں کے ساتھ مسلّح ہو کر دربار میں حاضر ہُوا ـــــ جب وہ سرائے سے روانہ ہُوا تھا، اس وقت تلفارس سویا ہُوا تھا۔ الاؤ کی راکھ میں چند چنگاریاں دبی پڑی تھیں۔ غیاب پاس پڑا تھا۔ فرید ابنِ سعید ایک لمحہ اُس کے قریب

رُکا تھا، اُسے بیدار کرنا چاہا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ لوگوں نے ویران بازار میں سے گزرتے ہوئے اُسے دیکھا تھا اور اُن کی طرف دیکھ کر اُس کے جی میں آیا تھا: "کسی کو جھنجھوڑ کر جگانا ٹھیک نہیں!"

ملکہ بڑی مروّت سے پیش آئی۔ وزرا و اُمرا، سب خاموش بیٹھے تھے۔ جفیل کے چہرے پر بھی تناؤ نہ تھا، ایک ٹھہراؤ تھا اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔

"آج جمعہ کی مبارک ساعت تھی۔ قاعدے کے مطابق بازار لگنا چاہیے تھا" ملکہ نے بڑی ملائمیت سے کہا۔

"جی ہاں ملکہ آپ ٹھیک فرماتی ہیں . . . " فریدابنِ سعید نے سنجیدگی سے جواب دیا: "میں جب بھی اپنا مال و اسباب لے کر اُجا نبر آتا ہوں، قاعدے کے مطابق بازار لگنے سے پہلے حکیم عابد، خدا کے حضور میں تاجروں کی برکت کے لیے دعا کرتا ہے . . . وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ رات میں نے اپنے ملازم کو اُس کے گھر بھیجا تھا، وہاں نہ عابد تھا نہ کوئی اور نفس . . . مجبوراً بازار ملتوی کرنا پڑا۔"

سارے دربار میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ ملکہ نے سپہ سالار جفیل کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے بے چین ہو رہا تھا۔ وزرا و اُمرا، سب کے سر جھک گئے تھے —— ملکہ گھبرا سی گئی۔

سپہ سالار جفیل نے فوراً کہا: "محترم امیر، حکیم عابد کا اب دُعا پڑھنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ وہ حراست میں ہے اور اس کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے . . . اس پر بادشاہ کو مار ڈالنے کا الزام ہے۔ اس نے اونٹوں کو جلاب دینے والی دوا ہمارے نیک اور مہربان بادشاہ کو پلائی تھی جس سے ہمارے آنجہانی بادشاہ کی جلد پھٹ گئی تھی، خون پھوٹنے لگا تھا . . . وہ کربناک حالت میں جاں بحق ہوئے تھے۔"

سپہ سالار جفیل کی اس اطّلاع سے اُمرا اور وزرا کے چہرے حیرانی سے تن گئے۔ ملکہ کی گھبراہٹ دُور ہو گئی اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے عاشق کی فہم و فراست کی داد دی۔

"کیا اس بات کا علم اہلِ مُلک اور اہلِ دربار کو ہے؟" فریدابنِ سعید نے معاملہ کی تہہ

تک پہنچتے ہوئے پوچھا۔

"فریدابنِ سعید!" سپہ سالار جفیل دہاڑا: "تم ایک تاجر ہو اور تمہیں اپنی ہی حد تک رہنا چاہیئے۔ ہمارے ملک کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا حق تمہیں کسی طرح نہیں پہنچتا کہ تم اس ملک کے باشندے نہیں ہو . . ."

"جان کی امان پاؤں تو ملکہ صاحبہ میں کچھ عرض کردں . . ." فریدابنِ سعید جفیل کو نظر انداز کرتے ہوئے ملکہ سے مخاطب ہُوا۔

اجازت ہے امیر!" ملکہ نے ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا کر، سر کی جنبش سے اجازت دی۔

"جس ملک میں سیاسی استحکام نہ ہو، تاجر اُس ملک میں تجارت نہیں کرتا۔ شہر کے دروازے میں قدم رکھنے سے پہلے اُس کا یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہاں کا بادشاہ اور رعایا دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں یا نہیں . . . تاجر جس ملک میں بھی تجارت کرنے جاتا ہے۔ اُسے اپنا ہی ملک سمجھتا ہے۔ وہاں کے حاکم کا بھی فرض ہے کہ تاجر کو اپنے ہی ملک کا شہری سمجھے اور اسے وہی سہولتیں دے جو اپنے شہری کو دیتا ہے . . ." فریدابنِ سعید نے کہا۔

اس سے پہلے کہ سپہ سالار جفیل زبان کھولتا، ملکہ نے کہا: "ہم اپنے محترم مہمان کے خیالات کی قدر کرتے ہیں اور اسے اپنا ہی شہری سمجھتے ہیں . . . کیا امیر کو محصول کی شرح بڑھائے جانے پر بھی کچھ اعتراض ہے ؟"

"جی ہاں ملکہ صاحبہ، یہ غیر واجب ہے۔ اس کا فیصلہ تجارت کرنے والوں کے مشورے کے بغیر نہیں کیا جانا چاہیے تھا!"

"ہم اپنا حکم واپس لیتے ہیں۔ اُجانیر کی شاندار روایت برقرار رکھنے کے لئے ہم ہر قربانی کے لئے تیار ہیں . . ." ملکہ نے انتہائی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے بات کو بڑھنے سے روک دیا اور فریدابنِ سعید کو باعزت طور پر دربار سے رخصت کیا۔

چائے میں چمچ چلاتے ہوئے میری بیوی نے پیالہ میرے سامنے رکھا اور مُسکرا کر کہنے لگی: "اب تک کی داستان سُن کر دو سوال میرے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔"

"دو سوال ؟" مَیں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"داستان گو نے اپنے کرداروں کا حُلیہ اور اُن کے لباس اور اُن کی وضع قطع کے بارے میں کچھ بیان نہیں کیا ہے، صرف ناموں سے فضا قائم کی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرید ابن سعید شہریت کا حق پاکر اور محصول میں کمی کروا کر، باز فادی کے قتل اور عابد کے جرم کا سوال بالکل بھول گیا۔"

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: "تم نے ٹھیک کہا۔ میں سمجھتا ہوں شاید داستان گو کا موضوع کردار، اُن کا حُلیہ اور ان کا زمانہ نہیں بلکہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ کردار، حُلیہ، نام، لباس اور وقت، سب بدل گئے ہیں مگر مسئلہ اپنی جگہ قائم ہے۔ غالباً اسی لئے داستان گو نے مسئلے کے خط و خال ابھارنے پر زور دیا ہے۔ شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہم ہمیشہ چھوٹی چھوٹی مراعات پا کر بڑے بڑے سوالوں کو بھول جاتے ہیں۔ اب یہ تو خیر آگے پڑھنے پر ہی پتہ چلے گا کہ کیا فرید ابنِ سعید اپنے مہربان دوست باز فادی اور وفادار دوست عابد کو واقعی فراموش کر کے ملکہ شبر وزی کے دربار سے رخصت ہوا ..." لہٰذا میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

پہلے سات دن تک بازار لگا۔ ہر روز لاکھوں کا لین دین ہوتا رہا۔ آٹھویں دن لکھا جوکھا کرنے کے لیے تاجروں نے چھٹی کی ـــــ تلقارمس نے انعام میں پایا ہُوا سامان ایک ہزار اشرفی میں بیچنے کے بعد، ایک علیل تاجر کا سامان اونے پونے داموں خرید کر پھر بیچ ڈالا اور اسے مزید چار سو اشرفی منافع ہُوا ـــــ اس نے اپنا غیاب سرائے کے کمرے میں رکھ دیا تھا اور تجارت کے اسرار و رموز جاننے میں لگا رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہُوا تھا کہ نغمے الاپنے کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ رکھا دھرا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خواب بُننے لگا: مال و اسباب سے لدے ہوئے اُونٹ، ملازم اور صحرا کی راتوں کی ٹھنڈی ہوا ... آہ! ایسے میں غیاب بجانے کا لُطف ... وہ بہت مسرور تھا۔

چھٹی والی رات فرید ابنِ سعید کے دسترخوان پر ایک مہمان آنے والا تھا۔ اس رات اس نے الگ سے طعام کا انتظام کیا ـــــ قافلے کے دوسرے لوگ اپنے خیموں میں اشرفیوں کی تھیلیاں دبائے ہنستے کھیلتے، کھانے میں مصروف تھے کہ سرائے کی پچھلی

طرف کی کھڑکی کے سامنے دو سائے رُکے۔ دونوں سائے کمبلوں میں لپٹے چھپے تھے ــــــ پھر کھڑکی کھلی اور دونوں سائے اندر کود گئے اور راہ داری کے راستے فرید ابنِ سعید کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ ان کے داخلے کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔

دونوں سایوں نے کمبل اُتارے ــــــ ایک سایہ یوسف تھا اور دوسرا ــــــ دوسرا تھا داروغۂ جیل۔ فرید ابنِ سعید نے کہا: "خوش آمدید!"

داروغۂ جیل آگے بڑھا اور اس نے امیر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور پھر اسے چوما: "کیوں شرمندہ کرتے ہو امیر! اگر تم نہ ہوتے، میرا وجود کب کا ختم ہو گیا ہوتا اور صحرا کے گدھوں تک کو میری لاش نہ ملتی۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے یاد کیا۔ تم نے مجھے سازشی جفیل سے بچایا تھا، یہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میرے لیے کوئی حکم، کوئی خدمت؟"

"تو آؤ دسترخوان لگ چکا ہے . . ." فرید ابنِ سعید نے مسکراتے ہوئے دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔

داروغۂ جیل نے پہلے امیر کی طرف دیکھا، پھر یوسف کی طرف اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی ــــــ پھر تینوں نے دعا کی، خدا کا شکر ادا کیا (کہ انھیں اس وقت کا رزق نصیب ہوا) اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔

داروغۂ جیل جس کا نام مُرشد تھا، بادشاہ بازفادی کے زمانے میں فوج میں ملازم تھا اور یوں سپہ سالار جفیل کا رقیب تھا ــــــ امیر فرید ابنِ سعید (کہ مُرشد کا محسن تھا) نے بادشاہ بازفادی سے کہہ کر مُرشد کو فوج سے الگ کروا کر محکمۂ جیل میں رکھوا دیا تھا ــــــ پیارے قارئین ویسے یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی . . .

دورانِ طعام فرید ابنِ سعید نے پوچھا: "مُرشد! کیا تم بتا سکتے ہو، عابد کا کیا ہوا؟"

مُرشد نے نوالہ مُنہ میں ڈالنے سے پہلے ہاتھ روک لیا۔ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، پھر بولا: "عابد محل کے نیچے تہہ خانے میں قید ہے۔"

"کس جرم میں؟"

"آج کی تاریخ رقم کرنے کے جرم میں۔" مُرشد نے جواب دیا اور نوالہ مُنہ میں ڈال لیا۔

"کیا وہ بازفادی کے قتل کی اصلیت سے واقف ہے؟"

"ہاں امیر... ! اس نے اپنے روزنامچے میں درج کیا تھا کہ ملکہ اور جفیل نے مل کر بادشاہ کو قتل کیا۔ اس نے یہ بھی درج کیا تھا کہ خود پسند ملکہ شبر وزری اپنے حسن کو قوت سمجھتی ہے اور اپنے حسن کے بل بوتے پر ملک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے۔" "کیا عابد کی رہائی ممکن ہے؟"

مرشد سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا: "صرف ایک صورت ہے... اگر ہم عابد کی جگہ کسی اور کو تہہ خانے میں رکھ سکیں تو... لیکن بھید کھلتے ہی اس دوسرے شخص کی موت یقینی ہے۔"

فرید ابنِ سعید نے ایک گہری سانس لی: "دوسرے شخص کا انتظام ہو جائے گا... مرشد! اب عابد کی رہائی تمہارے ذمے ہے۔"

یوسف نے سر اٹھایا، اپنے آقا کی طرف دیکھا، اور پھر مسکرایا: "آپ نے درست فرمایا امیر! دوسرا شخص حاضر ہے..."

فرید ابنِ سعید اور مرشد نے گھوم کر یوسف کی طرف دیکھا اور دونوں کے دل درد سے بھر گئے۔

بازار کل چودہ دن لگتا تھا ـــــ تیرہویں رات یوسف محل کے تہہ خانے میں بنے جیل میں بھڑ بھونجے کے لباس میں عابد کو کھانا دینے گیا ـــــ ان کا انتظام مکمل تھا ـــــ اور پھر بھڑ بھونجے کے لباس میں عابد جیل سے باہر نکل آیا۔

رات گہری تھی۔ چاند نظروں کے احاطے میں نہیں تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں عبادت کدہ سر جھکائے خاموشی سے کھڑا تھا ـــــ عابد سر جھکائے عبادت کدے میں داخل ہوا (اس طے شدہ جگہ پر فرید ابنِ سعید اس کا منتظر تھا)۔ دونوں دوستوں نے نظریں ملتے ہی بازو ایک دوسرے کی طرف پھیلا دیے، دونوں بغل گیر ہوئے اور دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

قارئین! وہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے، دونوں دوست بے خبر تھے۔ انھیں تو بس اتنی خبر تھی کہ ان کے دل کے کسی کونے میں ایک آواز گونج رہی ہے: مرحبا یوسف!

فرید ابنِ سعید نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا: "ظالم جفیل اور بدکار ملکہ شاید اس لیے تمہیں قتل نہ کر سکے کہ خدا کو ہم دونوں کی ملاقات منظور تھی اور غائب میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو امیر! اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اس مسودے کو حاصل کرنا چاہتے تھے جس میں مَیں حال کی تاریخ رقم کر رہا تھا... مَیں نے ہزار ظلم سہے، لاکھ صعوبتیں اٹھائیں لیکن انھیں یہ خبر نہ دی کہ مسودہ کہاں ہے... مَیں جانتا تھا کہ جیسے ہی ان ناہنجاروں کے ہاتھ مسودہ لگے گا میرا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔"

آفرین میرے دوست! کتنے ہوں گے تم جیسے جو ان مسودوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں جن میں وقت دل کی طرح دھڑکتا ہے..."

"کل رات چلنے کی تیاری ہوگی اور پرسوں، فجر کے وقت کارواں روانہ ہوگا۔ تم اور تمہارا وہ مسودہ جس میں وقت دل کی طرح دھڑکتا ہے، کارواں کی حفاظت میں ہوگا... اور جب صدیوں بعد اُجاڑ شہر کے کھنڈروں میں سے گزرتے ہوئے کوئی بکھرے ہوئے پتھروں سے یہ پوچھے گا، اے بدنصیب شہر! تجھ پر کیا بیتی؟ ہر پتھر کی زبان سازشوں اور ظلم کی داستان بیان کرے گی..." فرید ابنِ سعید نے دھڑکتے دل سے کہا۔

دونوں عبادت کدے سے باہر نکلے اور صحرا کی گہری رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

چودھویں رات اونٹوں کی پیٹھوں پر جھولیں ڈالی جا رہی تھیں، محمل باندھے جا رہے تھے کہ صحرا کی فجر کے اندھیرے میں کارواں کو کوچ کرنا تھا ــــ اُدھر جیسے سپہ سالار جبیل کے ننگے بدن پر چیونٹی رینگ گئی۔ وہ ملکہ شبروزی کے برہنہ جسم کی کڑی گرفت سے ایک تیز جھٹکے سے نکلا، دروازے تک آیا اور دروازے کے پٹ ذرا کھول، اس نے کرخت آواز میں پوچھا: "کون ہے؟ کس نے اس جگہ، اس وقت آنے کی ہمت کی ہے؟"

دروازے کے باہر، ذرا ہٹ کر کھڑا جبیل کا پہرے دار کانپتی آواز میں بمشکل تمام روداد بیان کر سکا ــــ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ فرید ابنِ سعید کا ملازم تو جیسے بالکل گنگ ہے، اس کے منہ سے تو چیخ تک نہیں نکلتی۔

سپہ سالار جبیل کا ننگا بدن غصے سے کانپنے لگا۔ پھر وہ غضب ناک آواز میں گرجا: "سپاہ کو تیار رہنے کا ہمارا حکم سُنا دو اور چھاؤنی کے میدان میں ہماری آمد کا انتظار کرو۔"

تلقارمس نے اشرفیاں گنیں، تھیلی میں ڈالیں اور تھیلی کو نیفے میں اڑس لیا ـــــ اسکا اونٹ جگالی کرتا ہُوا اس کی طرف تک رہا تھا۔

تلقارمس نے سوچا: وہ قافلے کے ساتھ اگلے شہر جائے گا اور یہاں سے خریدا ہوا سامان وہاں فروخت کرے گا، پھر وہاں سے خریدا ہُوا سامان اگلے شہر میں فروخت کرے گا اور وہ دن دُور نہیں، جب وہ شہر شہر، بازار بازار تجارت کرتا ہُوا بہت بڑا تاجر بن جائے گا اور امیر فرید ابنِ سعید کی طرح ایک بڑے کارواں کا مالک ہو گا، سینکڑوں اونٹ اور لاکھوں کروڑوں کا مال اسباب اس کی ملکیت ہو گا۔

وہ اپنی خوش گوار سوچ میں غرق تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے، دیوار کے ساتھ ٹکا رکھا اس کا غیاب، زمین پر چھن سے آ پڑا۔ اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹا اور وہ غیاب کی طرف لپکا۔ اس نے غیاب اٹھایا۔ غیاب صحیح سلامت تھا۔ اس نے غیاب سینے سے لگایا تو اشرفیوں کی تھیلی نیفے سے پھسل کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے جھک کر تھیلی اُٹھائی تو غیاب کا گز ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا ـــــ وہ پریشان ہو گیا۔

شہر اُجانیر کا صدر دروازہ رات کو بند نہیں کیا گیا تھا۔ بہت سے تاجروں نے اپنے اونٹ شہر کے باہر فصیل کے ساتھ باندھ دیے تھے کہ کارواں چلے تو آگے جگہ پا سکیں۔ رات تھی کہ رتجگہ، رات بھر چہل پہل رہی تھی ـــــ رات کے پچھلے پہر مشرقی افق پر ایک ستارہ ٹوٹا اور لَو دے اٹھا۔ ستارے کی بشارت پا کر فرید ابنِ سعید نے کوچ کا حکم دیا ـــــ چند ہی لمحوں میں اونٹوں کی گردنوں کی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔

آہ . . . فجر کا یہ وقت، خلائے رحمت جیسا دھندلکا، افق پر چمکتی ہوئی طلسمی آنکھ اور اونٹوں کی گردنوں میں جھولتی گھنٹیوں کے نغمے ـــــ تلقارمس کا جی چاہا، غیاب کی دُھن پر الوداعی نغمہ چھیڑ دے ـــــ اس نے دھیرے دھیرے نغمہ چھیڑا:

اے نیل کے ساحل پر کھڑے فرشتے،

الوداع!

تم ہمیں بلانا، ہم پھر آئیں گے۔
تو ہمیں رزق دیتا ہے؛ جتنا ہمارے مقدر میں لکھا ہے۔
تیری مٹی پر سے ہمارے اونٹوں کے
نقشِ پا کبھی مٹ نہ سکیں گے۔
اگلی صبح جب ہم صحرا میں بیدار ہوں گے،
اللہ کی حمد گائیں گے کہ اس نے ایک اور صبح ہمیں دکھائی
اور تمہیں ہم سلام بھیجیں گے۔
ہوائیں جب تمہیں ہمارا سلام دیں تو
اے اُجانیر کے فرشتے!
تو ہمیشہ کی طرح
اپنی شفقتیں ہمیں بخشنا!

نغمہ سُن، سب سوگوار ہو گئے اور یوں تاجر بجھے بھرے بھرے دلوں سے اُجانیر کے صدر دروازے سے باہر نکل کر، قطار در قطار آگے بڑھنے لگے۔

اُجانیر کا گرد و نواح کہ ایک عظیم نخلستان تھا، کارواں نخلستان کی ہریالی پیچھے چھوڑ کر، سامنے پھیلے صحرا کی ریت کے لب چومنے ہی والا تھا کہ سامنے ہزاروں چمکتی ہوئی ننگی تلواریں دکھائی دیں ـــــ تلواریں سیلاب کی طرح کارواں کی طرف بڑھنے لگیں۔ سب حیرانی سے چند لمحوں کے فاصلے سے آتی ہوئی اُفتاد کو دیکھ رہے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ آناً فاناً تلواریں اُٹھیں اور تاجروں کے جسموں پر آن گریں ـــــ فضا میں خون کے فوارے اُچھل پڑے۔

فرید ابنِ سعید پہلے تو کچھ نہ سمجھا لیکن پھر وہ بھید دوزخ کے دروازے کی طرح کُھل گیا۔ اس نے محمل میں چھپے بیٹھے عابد کی طرف دیکھا جو مارے خوف کے دُبکا پڑا تھا ـــــ فرید ابنِ سعید نے میان میں سے اپنی شمشیر کھینچ نکالی اور اللہ کا نام لیتے ہوئے اونٹ سے نیچے کود گیا۔ دوسرے تاجروں نے بھی تلواریں اور بھالے سونت لیے اور پھر جم کر لڑائی شروع ہوئی، مگر کب تک؟ تاجر بچہ گھر سے تجارت کرنے نکلتا ہے، لڑائی لڑنے نہیں۔ بہت سے تاجر شہید ہو گئے؛ بہت سے

تاجر سپہ سالار جفیل کی فوج کے نرغے میں پھنس کر گرفتار ہو گئے، کچھ نکل بھاگے۔ نکل بھاگنے والوں میں تلفارمس بھی تھا۔ اس کی اشرفیوں بھری تھیلی کہیں پھسل کر گر گئی تھی۔ وہ بمشکل اپنا غیاب بچا پایا تھا ۔۔۔ فرید ابنِ سعید شدید طور پر مجروح ہوا اور گرفتار ہوا۔ عابد اس مسودے سمیت جس میں وقت دل کی طرح دھڑکتا تھا، پکڑا گیا۔

دربارِ عام میں زنجیروں میں بندھے جکڑے فرید ابنِ سعید، عابد اور یوسف کو پیش کیا گیا۔ استغاثہ نے تینوں کے جرائم کی تفصیل پیش کی۔ شاہانہ ٹھاٹ سے تخت پر سجی بیٹھی ملکہ شبروزی نے بڑی سنجیدگی سے مقدمے کی کارروائی سنی اور پھر ملزموں سے مخاطب ہوئی: "آپ لوگ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

دربارِ عام کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام امرا اور وزرا بہترین لباسوں میں، چمکتی ہوئی پیشانیوں کے ساتھ موجود تھے ۔۔۔ سب طرف سناٹا تھا۔

ملکہ نے قریب ہی پڑی ہوئی ایک چوکی پر رکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر کہا: "ہمارے ملک کے دستور کے مطابق ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تینوں ملزم اپنے حق کا استعمال کریں۔"

وہ کتاب کافی بھاری بھرکم تھی۔ اس کی جلد پر خون سے لتھڑے بیسیوں انگوٹھوں کے نشان تھے کہ قاعدے کے مطابق ہر حکمران کو تاج پوشی کے وقت اپنے ہی خون میں اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ڈبو کر کتاب پر لگانا پڑتا تھا اور قسم کھانا پڑتی تھی کہ وہ ملک اور قوم کا وفادار رہے گا ۔۔۔ اور اس کتاب میں سب رقم تھا کہ حاکم کو اپنی رعایا پر کس طرح حکومت کرنا ہے ۔۔۔ صدیاں بیت چکی تھیں، کئی حکمران بدل چکے تھے لیکن کتاب میں لکھی ہوئی ہدایتیں ویسی کی ویسی تھیں۔ جو حاکم بھی آیا، اس نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور محسوس کیا کہ کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے اس کی اپنی ہستی خطرے میں پڑتی ہو ......

اس کتاب کی جلد کے ایک کونے میں ملکہ شبروزی کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان موجود تھا ۔۔۔ ملکہ نے تیسری بار کہا: "دستور کے مطابق ملزم سے تین بار پوچھنا ہمارا فرض ہے ... آپ لوگ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

فرید ابن سعید شدید طور پر مجروح تھا۔ وہ کچھ کہنے کے قابل نہ تھا۔ یوسف اپنے آقا اور اپنے آقا کے دوست عابد کی موجودگی میں زبان کھولنا مناسب نہ سمجھتا تھا —— آخر عابد نے دھیرے سے گردن اونچی کی، درباریوں کو ایک نظر دیکھا، ملکہ شبر وزی کے چہرے پر نگاہیں جمائیں اور پھر سپہ سالار جفیل پر گاڑ دیں۔ پھر دستور کی کتاب کو گھورتا ہوا بولا: "اس کتاب سے انصاف کی کوئی امید نہیں . . ." اس حکومت سے انصاف کی کوئی امید نہیں۔ اس نظام سے انصاف کی کوئی امید نہیں . . ." سب طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ عابد کی جسارت سے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔

سپہ سالار جفیل اُٹھ کھڑا ہوا اور غضب ناک آواز میں گرجا: "اس کتاب سے انحراف بغاوت ہے اور اس کی سزا . . ."

"یہ کتاب تم جیسے سازشیوں کی رفیق ہے۔ اس میں لکھا ہوا دستور، جرائم اور سزاؤں کا احوال جب آنے والی نسلیں جانیں گی تو تمہاری ذات پر حیف کہیں گی . . ." عابد کی کڑک دار آواز گونجی: "جسے تم باغی قرار دیتے ہو، وہ عوام کے لیے نہیں تمہارے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ کیا تمہاری یہ اندھی اور بہری کتاب کسی باغی کے دل کی دھڑکن دیکھ سکتی ہے، سُن سکتی ہے؟"

ملکہ شبر وزی نے ہاتھ بلند کیا تو سنّاٹا چھا گیا: "بزرگ عابد! اس اندھی اور بہری کتاب ہی نے تمہیں یہ آزادی دی ہے کہ تم سر بازار حاکموں کو سازشی کہہ رہے ہو۔ ہماری خواہش تھی، تم اپنے جرم کا اقبال کر لیتے اور رحم کی درخواست کرتے . . . اور ہم تمہاری پرانی خدمات کے صلے میں تمہاری جان بخش دیتے۔"

"اے بدکردار عورت، تم سے بھیک میں ملی ہوئی جان مجھے قبول نہیں۔ حق اور صداقت کی راہ میں موت یقینی ہے اور ہمیں منظور ہے۔ آج ہم اس منزل پر آ پہنچے ہیں جہاں زندگی مکروہ ہے، موت حسین ہے . . ."

"ع آ آ عابد . . . !" ملکہ چنگھاڑی اور غصے سے کانپتی مسند سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ سب خاموش تھے۔ کوئی سانس تک نہ لے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی پرانے عبادت کدے میں مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔

ملکہ شبر وزی جب دوبارہ اپنی مسند پر بیٹھی تو دھیرے دھیرے سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ

گئے) تو اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اس نے بمشکل کہا: "مجرموں کو دستور کے مطابق سزا دی جائے۔۔۔"

دربار کا مہتمم آگے بڑھا۔ اس نے چوکی پر رکھی ہوئی دستور کی کتاب اٹھائی، ورق پلٹے اور ایک ورق پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنا شروع کیا "۔۔۔ وہ جو حکومتِ وقت کے رائج کردہ قوانین پر شک کرے گا۔ انتظامیہ میں رخنہ ڈالے گا، سازش کرے گا، اسے باغی جانا جائے گا اور اسے بذریعہ سنگ باری سزائے موت دی جائے گی۔ اور مُلک کا جو شہری باغی پر سنگ باری سے انکار کرے گا، اسے بھی باغی جانا جائے گا اور اسے بھی یہی سزا دی جائے گی۔۔۔"

"دربار برخواست۔۔۔!" ملکہ شبروزی اٹھی اور دربارِ عام سے چلی گئی ——— اس کے پیچھے سپہ سالار جفیل تھا۔

ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وہ شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی ——— سپاہ تینوں مجرموں کو دربارِ عام سے گھسیٹ لے گئی۔ مجرموں کی زنجیروں کی جھنکار شور و غل تلے دبی رہ گئی۔

اگلی صبح شہر اُجابنر کے مرکزی چوراہے پر، جس کے وسط میں بادشاہ بازفادی کا مجسّمہ نصب تھا۔ زنجیروں میں جکڑے بندھے تینوں مجرموں کو لا پٹخا گیا ——— پھر شاہی منادی نے شہر کے گلی کوچوں میں شاہی فرمان سُنایا: "مُلک خدا کا، حکم ملکہ کا۔۔۔ حکیم عابد و امیر فرید ابنِ سعید و غلام یوسف کہ جن پر انتظامیہ میں رخنہ ڈالنے، سازش اور بغاوت کرنے کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور جنھیں بذریعہ سنگ باری سزائے موت دی گئی ہے، ملک کے عوام کے سامنے پیش ہیں۔ ہمارے ملک کی عظیم الشان روایت اور ہمارے ملک کے دستور کے مطابق خلقِ خدا خود اپنے ہاتھوں مجرموں کو سزا دے گی۔ ہر شہری کا قومی فرض ہے کہ وہ مجرموں پر سنگ باری کرے۔۔۔ حکم عدولی کرنے والے کو بھی یہی سزا دی جائے گی۔"

سپاہ لوگوں کو گھروں سے نکال رہی تھی اور مرکزی چوک کی طرف دھکیل رہی تھی ——— خدا کے تینوں نیک بندوں پر سنگ باری شروع ہو چکی تھی۔

میرے بچے اسکول سے واپس آگئے تھے۔ میری بیوی ان کے لیے کھانا اور میرے لیے

چائے بنا رہی تھی۔

میں نے مسودہ ایک طرف رکھ دیا اور آنکھیں مُوند لیں : یہ دستور بھی عجیب چیز ہے۔ اس دستور کے مطابق حکومت کا سارا کام کاج چلتا ہے، پھر بھی مخالف پارٹی برسرِ اقتدار پارٹی پر الزام لگاتی ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی ڈھنگ سے کام نہیں کر رہی ہے، دستور کی بے حُرمتی کر رہی ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی یہ دلیل دیتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے، دستور کے مطابق کر رہی ہے ___ پھر مخالف پارٹی برسرِ اقتدار پارٹی بن جاتی ہے اور دستور کے مطابق کام کرنے لگتی ہے۔ اب پھر وہی الزام لگائے جاتے ہیں۔ یوں زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف پارٹیوں کا رول بدلتا رہتا ہے ___ آخر اس دستور میں ایسی کیا بات ہے کہ ہر کام اس کے مطابق ہوتا ہے مگر عوام کے مسائل حل نہیں ہو پاتے لیکن پھر بھی ہر پارٹی کو یہ دستور قبول ہے ___ دستور کو بدلنے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں، دستور صرف حکمرانوں کی سہولت کے لیے ہے؟

آپ نے کچھ کہا؟" میری بیوی نے رسوئی گھر سے آواز دی۔

"نہیں تو۔۔۔" میں حیران ہو گیا۔ آخر میری سوچ نے جس نے آواز کا سہارا نہیں لیا تھا میری بیوی تک کیسے پہنچ گئی؟

بازفادی سے پہلے، اس سے پہلے اور اس سے پہلے کوئی اور بادشاہ رہا ہوگا ___ جب ملکہ شبرِ وزی کا عہد آیا، تب بھی سب لوگ دستور کا احترام کرتے رہے ___ سارے ستم دستور کی اسی کتاب کے مطابق ڈھائے گئے۔ فرید ابنِ سعید اور عابد اور یوسف پر بارشِ سنگ اسی کتاب کے حکم سے ہوئی۔

تلقارس کارواں کے چند ساتھیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ شہر کے مرکزی چوراہے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں غیاب تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ زمین پر بکھرے پڑے پتھر چن چن کر اپنے جھولے میں سمیٹ رہا تھا۔ یہ پتھر اسے اپنے محسن پر برسانا تھے۔ وہ اپنی اشرفیاں خون خرابے میں کھو چکا تھا۔ اب اس کے پاس کھونے کو کچھ باقی نہ بچا تھا۔

دھوپ میں تینوں مجرم تین کھمبوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر جگہ جگہ زخم تھے۔ زخموں سے خون بہہ رہا تھا اور ان کے لباسوں کو گلزار بنا رہا تھا۔ وہ ظلم اور سازش کے

خلاف کھڑے ہوئے تھے اور ان کو حق اور صداقت کا ساتھ دینے کی سزا مل رہی تھی ـــــــ ان پر پتھر برسانے والے اکثر مرد، بچے اور عورتیں رو رہے تھے ـــــــ پتھر پھینکتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے۔ جب کسی کا پتھر مجرموں پر ٹھیک نہ بیٹھتا، اس کے جسم پر سپاہ کے کوڑے سڑاپ سے پڑتے اور وہ تیزی سے پتھر اکٹھا کرنے لگ جاتا۔ پتھر اکٹھا کرتے ہوئے کئی بار وہ مجرموں کے قریب پہنچ جاتا اور سہمی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا۔ غیر متوقع طور پر ان کی آنکھوں میں خوف کے برعکس فرشتوں کی شفقت دکھائی دیتی۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی ہوتیں: "تیرا شکریہ عزیز من! تو ہماری موت کو نزدیک لا رہا ہے اور ہمیں اس عذاب سے رہائی دلا رہا ہے۔" اور پتھر اکٹھا کرنے والا چھلکتی ہوئی آنکھیں لیے بھاگ کر وہاں لوٹ آتا جہاں سے اسے پتھر برسانا ہوتے۔

تلقارمس جب وہاں پہنچا، اس کا دل یہ منظر دیکھ بھر آیا۔ اس نے اپنے جھولے میں سے پتھر نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا تو اس کی ماں کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ اس کی ماں نے اس کے ہاتھ میں غیاب تھماتے ہوئے کہا تھا: "خدا کی رحمتیں، میرے بچے، ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں۔ تو مغنّی ہے اور یہ تیرے مرحوم باپ کا غیاب ہے۔ تیرے باپ کے گلے میں اللہ نے وہ سوز پیدا کیا تھا کہ پتھر بھی پگھل جاتے تھے۔ ایک دن تیرے باپ کا گلا اس لیے کاٹ دیا گیا کہ وہ ایک امیر کے مظالم کے خلاف نغمہ سرا ہوا تھا۔ تب تو بہت چھوٹا تھا میرے بچے! آج کہ تو غیاب تھامنے کے قابل ہو گیا ہے، جا اور اپنے باپ کا ادھورا کام پورا کر ـــــــ گھر سے باہر نکل کر، گھر کی طرف پشت کر کے پیچھے کی طرف سات پتھر اپنے آنگن میں پھینک دینا کہ تمہیں گھر کی یاد نہ ستائے اور اللہ کی یاد ہمیشہ خون کی طرح تمہاری رگوں میں دوڑتی رہے۔۔۔" اس نے غیاب تھام لیا تھا اور ماں کے پاؤں کو بوسہ دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ ظالم کے لیے نہیں، مظلوم کے لیے اپنے غیاب کے تار چھیڑے گا۔

"کیا وہ اپنا وعدہ پورا کر رہا ہے؟" وہ چونکا اور فوراً ہی اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ اس کا ایک ہاتھ کہ جھولے میں سے پتھر نکالنے کے واسطے داخل ہوا تھا، خالی باہر نکلا ـــــــ اس نے غیاب کا گز سنبھالا اور اب جو اس نے سر اٹھایا، اس کے ہونٹوں پر غلاموں کا ترانہ تھرک رہا تھا، ایک اسم کی طرح جس میں بلا کی طاقت تھی۔

خدایا تونے مجھے ہاتھ عنایت فرمائے،
تیرا شکریہ!
ہاتھوں کو تونے زنجیریں بنانے کا حکم دیا،
تیرا شکریہ!
زنجیروں کو تونے میرے بدن کا زیور بنایا،
تیرا شکریہ!

لوگ دھیرے دھیرے اس کے گرد اکٹھا ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر گانے لگے۔

——— لیکن یہ مجھے کون گھسیٹ رہا ہے خدایا؟

تلقارمس نے تان اونچی اٹھائی اور نادانستہ طور پر جھولے میں سے پتھر نکال کر قریب کھڑی سپاہ پر پھینک دیا ——— ہزاروں پتھر سپاہ پر برسنے لگے ———

یہ کوڑے کیا تیرے حکم سے برسائے جا رہے ہیں؟

اس نے تان اور اونچی اُٹھائی۔ لوگ جوش میں تھر تھر کانپنے لگے ——— ہزاروں لاکھوں پتھروں کی بارش میں سپاہ کے کوڑوں کی سڑاپ اور تلواروں کی دھار کسی کام نہ آئی اور ظالم سپہ سالار کی سپاہ لہو لہان ہو کر محل کی طرف بھاگنے لگی۔

——— تو اپنے زیور واپس لے لے اور مجھے
میرے ہاتھ دے دے،
تیرا شکریہ!

لوگوں میں عجیب ناقابلِ بیان جوش بیدار ہو گیا تھا ——— محل کے دروازے بند کر دیے گئے۔ سارے چھوٹے بڑے حاکم محل کے اندر تھے اور سارے محکوم محل کی چار دیواری کے باہر بڑے دروازے پر کھڑے اُونچی آواز اور اونچے سُروں میں گا رہے تھے:

——— تو اپنے زیور واپس لے لے اور مجھے
میرے ہاتھ دے دے،

تیرا شکریہ!

محل کے اندر ایک سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی۔ مُٹھی بھر مسلح سپاہ نے ہزاروں لوگوں اور لاکھوں پتھروں کے سامنے جانے سے انکار کر دیا تھا ــــ ملکہ شبر وزی نے چوکی پر رکھی دستور کی کتاب پر اپنے خون میں رنگے انگوٹھے کے نشان کو دیکھا اور مسکرائی اس نے قریب کھڑے سپہ سالار جفیل کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی پل بڑھ کر سپہ سالار جفیل کی کمر سے بندھی ہوئی میان میں سے تلوار کھینچ لی اور اپنے ذاتی محافظ کو حکم دیا کہ جفیل کو گرفتار کر لیا جائے۔

تلقارمس جب شہر کے مرکزی چوراہے میں بندھے ہوئے ان تین مجرموں کے قریب گیا، اس نے دیکھا وہ دم توڑ چکے ہیں ــــ ان کے لہولہان چہروں پر عجیب ملکوتی مسکراہٹیں تھیں۔

تلقارمس نے ان کے قریب بیٹھ کر ایک بار پھر غلاموں کا ترانہ چھیڑا اور لوگوں نے روتے روتے ان کے مردہ جسموں کو زنجیروں سے آزاد کر دیا ــــ تینوں مجرم نہ رہے تھے۔

تیرا شکریہ! تیرا شکریہ! تیرا شکریہ!

سورج غروب ہونے سے پہلے محل کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلا ــــ ملکہ شبر وزی کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ آگے پیچھے امرا، مشیر اور وزرا تھے۔ مٹھی بھر مسلح سپاہ کے بیچ زنجیروں میں بندھا جکڑا، زخمی اور نڈھال جفیل تھا۔

لوگوں نے جو اک ہجوم کی صورت اکٹھا تھے، ملکہ کو دیکھا اور آپ سے آپ دائیں بائیں ذرا دَبنے سمٹنے لگے۔ ہجوم کے درمیان آپ سے آپ راہ بنتی چلی گئی ــــ ملکہ شبر وزی شہر کے مرکزی چوراہے کی طرف بڑھی جہاں تلقارمس تین آزاد مردہ جسموں کے پاس غیاب بجا رہا تھا اور نغمہ سرا تھا۔

ملکہ شبر وزی نے مٹھی بھر مسلح سپاہ کو حکم دیا کہ تمام ہتھیار مغنّی تلقارمس کے قدموں میں ڈال دیے جائیں۔ چند ہی لمحوں میں گم سُم تلقارمس کے قریب ہتھیاروں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس نے بھیگا ہوا، غم میں ڈوبا ہوا چہرہ اٹھایا اور ملکہ شبر وزی کی طرف دیکھا ــــ ملکہ پلکیں جھپکائے بنا اسے تک رہی تھی ــــ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ تلقارمس کو محسوس ہوا، اسکا غمزدہ دل پھڑ پھڑا رہا ہے۔

ملکہ شبروزی نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا: "اے مغنّی! میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ عوام اور تیرے مجرم کو مَیں نے اب پہچانا ہے . . . جس شخص نے ظلم ڈھائے، میں اسے تیرے حوالے کرتی ہوں۔ انصاف تیرے ہاتھ میں ہے . . . مَیں مجبور تھی، میری زبان پر تالے لگا دیے گئے تھے لیکن آج میں یہ راز افشا کرتی ہوں کہ میرے خاوند مرحوم بادشاہ بازفادی کو سابق سپہ سالار جفیل کی ایما پر ہی قتل کیا گیا تھا . . . حکومت اُجانیر کی پرانی مجلسِ مشاورت توڑی جاتی ہے . . . مَیں صدقِ دل سے اعلان کرتی ہوں کہ اُجانیر کے عوام، میری رعایا اپنے جن نمائندوں کو چنے گی، میں ان کی مدد اور مشورے سے حکومت کروں گی . . . میں نے داروغۂ جیل کو سپہ سالار مقرر کیا ہے جو دراصل اس عہدے کا صحیح حقدار تھا اور اس کی حق تلفی ہوئی تھی . . . اے مغنّی! آج تو نے، تیرے نغمے نے اُجانیر کے عوام ہی کو نہیں، مجھے بھی ظلم اور نا انصافی کے عہد سے نجات دلائی ہے۔ میری اور میری رعایا کی نظروں میں تیرا بہت احترام ہے . . ."

ملکہ شبروزی وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس نے تلقارمس کے سامنے سر خم کر دیا۔

لوگوں کا ناقابلِ بیان جوش جو ملکہ شبروزی کے ہاتھ میں سفید جھنڈا دیکھ کر تھم سا گیا تھا، اب ملکہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز اور جھکے ہوئے نادم سر کو دیکھ کر پھر بھڑک پڑا۔

ہمارا مغنّی: زندہ باد!

ملکہ شبروزی: زندہ باد!

فرید ابنِ سعید، عابد اور یوسف کے آزاد مردہ جسموں کو نہایت احترام کے ساتھ شاہی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

جفیل کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا ــــــ وہ رات بھر کراہتا رہا اور انصاف کا انتظار کرتا رہا۔

رات بھر اُجانیر بیدار رہا۔

صبح دربار لگا۔ ملکہ شبروزی تخت پر سجی بیٹھی تھی۔ برابر کی نشست پر تلقارمس بیٹھا تھا۔ اس کا غیاب نشست کی پشت کے ساتھ ٹکا ہوا تھا۔ وزرا اور مشیروں کی نشستیں خالی تھیں۔

اتفاقِ رائے سے عوام نے تلقارمس کو وزیرِ اعلیٰ چنا اور اسے اپنے مشیر چننے کا حق دیا۔

تلقارمس نے شہر اُجانیر کے تیرہ نہایت معتبر لوگوں کا انتخاب کیا —— سب مسکراتے ہوئے چہرے لیے خالی نشستوں پر جا بیٹھے۔ دربار تالیوں اور نعروں سے گونجنے لگا۔

سب تعظیم سے کھڑے ہوئے اور سب نے دستور کا وفادار رہنے کی قسم کھائی۔

نئی حکومت کا پہلا کام جفیل کا مقدمہ تھا —— زنجیروں میں جکڑے ہوئے جفیل کو پیش کیا گیا اور دستور کے مطابق حکم پڑھا گیا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔

جفیل نے حکم سُنا اور اپنی سُرخ آنکھیں ملکہ شبروزی کے رنگ بدلتے چہرے پر گاڑ دیں —— چند لمحوں کے بعد اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا: "کُتیا!" اور حقارت سے فرش پر تھوک دیا۔

اُجانیر کا وہ دن نجات کا دن تھا، اس دن کی رات آزادی کی رات تھی اور اسی طور منائی گئی۔ دریائے نیل میں سینکڑوں جلتے ہوئے چراغ بہائے گئے۔ بھٹیار خانوں میں تمام رات گوشت بھنتا رہا اور لوگوں نے ایک دوسرے پر شرابیں اُنڈیل اُنڈیل دیں۔

اُدھر محل میں جشن کا رنگ ہی کچھ اور تھا —— تمام امرا، وزرا اور عہدے دار رات بھر دادِ عیش دیتے رہے —— اور جب ہر شخص ترنگ میں تھا، آس پاس سے بے خبر تھا اور چاند آسمان کے بالکل وسط میں تھا، ملکہ شبروزی نے تلقارمس کا ہاتھ تھام کر دل گرماتی ہوئی بھنچی بھنچی آواز میں کہا: "آؤ تمہیں دکھاؤں، ہمارا اُجانیر اور اس کا گرد و نواح اور اس پر جھکا ہوا آسمان کتنا حسین ہے . . ."

تلقارمس آپ سے آپ ملکہ کے ساتھ کھنچتا چلا گیا —— غلام گردشیں، زینے —— زینہ کھنچتا کھنچتا وہ محل کی چھت پر پہنچ گیا۔ ملکہ اسے محراب کے نیچے کھینچ لے گئی۔

یہی محراب اس نے محل کے نیچے سے، محل کے باہر سے بھی دیکھی تھی۔ باہر سے اس نے جب بھی محل دیکھا تھا، اسے بہت خوبصورت لگا تھا —— چاند آسمان کے بالکل وسط میں تھا۔ اسے دھیان آیا، جب وہ فریدابنِ سعید کے قافلے کے ساتھ شہر اُجانیر میں وارد ہوا تھا، اُس رات سب نے چاند دیکھا تھا اور کہا تھا کہ یہ نیک فال ہے —— محل کی چھت پر جھکا ہُوا آسمان، آسمان کے وسط میں چاند، نیچے شہر، پیڑ اور چاندی کی لکیر سا دریائے نیل، مکان اور مکانوں

کے سائے۔ جی تڑپے کہ عمر جاودانی مل جائے۔ محل کی یہ چھت، یہ محراب، یہ منظر۔۔ حسن کی یہ تصویر کشی۔۔۔

"کیا تم میرے لیے ایک نغمہ نہ گاؤ گے؟"

سکوت میں سے دھیرے سے اُبھرتی آواز نے تلقارمس کو چونکا دیا۔ اس نے تعجب سے ملکہ شبروزی کی طرف دیکھا ـــ اسے ملکہ شبروزی حسن کی تصویر کشی کا بھید محسوس ہوئی۔ وہ بمشکل کہہ سکا: "۔۔۔ میرا غیاب۔۔۔؟ میرا نغمہ۔۔۔!"

ملکہ شبروزی نے ایک ہاتھ سے تلقارمس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں پشت سے لگا ہوا تلقارمس کا غیاب تھا: "تمہارا غیاب مجھ سے جدا نہیں۔۔۔ یہ لو!" اس نے بڑی پرکشش آواز میں کہا۔

تلقارمس نے کانپتے ہاتھوں سے غیاب تھاما، اسکے تاروں پر گز پھیرا اور پھر نغمہ اسے لے اُڑا۔

میں کہاں ہوں، یہ لگن کیا ہے!
تم ہی کہو یہ مژدۂ بہار ہے؟
بھٹکتا، ٹھوکریں کھاتا
منزل پر پہنچا ہوں،
مگر یہ انتظار کے فاصلے کیسے ہیں؟
کتنے دردناک لمحے ہیں!

غیاب کی دُھن، نغمے کے بول، سکوت کو چیرتی ہوئی حسرت بھری آواز ـــ تلقارمس آسمان میں کہیں کھو گیا۔ اپنے ہونے نہ ہونے کا، چاند اور گنبدوں کا، برجیوں کے سایوں کا، اسے کسی کے وجود کا احساس نہ رہا۔ دھیرے دھیرے اس کی حسرت بھری آواز اور غیاب کی دُھن اک انجانی تھکن اک انجانی نیند میں ڈوب گئی ـــ جب وہ بیدار ہُوا، اس کے لبوں پر ملکہ شبروزی کے شہوانی لب پیوست تھے: "اتنا دل پذیر نغمہ میں نے آج تک نہیں سُنا ہے۔۔۔ یہ رس بھرا بوسہ میری قدردانی ہے۔۔۔ عورت جب کسی کی قدر کرتی ہے، یہی لازوال سوغات

دیتی ہے ..."

ابھی تلقارمس نہ سنبھل پایا تھا، نہ کچھ سمجھ سکا تھا، ملکہ شبر وزی زینوں میں کہیں اوجھل ہو گئی۔

میری بیوی اور بچے بڑے انہماک سے داستان سُن رہے تھے کہ یہ داستان کا بڑا خطرناک موڑ تھا۔ میں نے دیکھا، ان کے چہرے قدرے زرد پڑ گئے ہیں اور ان کے ہونٹ سوکھ سے گئے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی ——— وہ داستان میں کھوئے ہوئے تھے۔

اُجانیر میں ملکہ شبر وزی کی سرپرستی میں نئی حکومت قائم ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ حکومت کا کام کاج بڑی خوش اسلوبی سے، لوگوں کی خواہش کے مطابق چل رہا تھا ——— ملکہ شبر وزی اور تلقارمس راتوں کو شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے اور دیکھتے بھالتے: کوئی سردی سے ٹھٹھر تو نہیں رہا! کوئی بھوکا تو نہیں سو گیا!

تلقارمس نے سوچ رکھا تھا: شہر اُجانیر میں ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمّہ داری میری ہو گی۔

ملکہ کا دن رات کا ساتھ تلقارمس کو اندر ہی اندر سلگا رہا تھا۔ وہ اس احساس کو کوئی نام نہ دے پا رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ملکہ کے لیے تڑپ رہا ہے اور وصال ہی سے اس کے اندر کی آگ بجھ سکتی ہے۔

ملکہ شبر وزی تلقارمس کی ذہنی حالت سے باخبر تھی ——— وہ طرح طرح سے اس کی آگ بھڑکاتی۔ کبھی کبھی وہ دانستاً بے خبری برتتے ہوئے اپنا جسم تلقارمس کے سلگتے ہوئے جسم سے مَس کرتی اور پھر یوں الگ ہو جاتی جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ تلقارمس لمس کی حدّت لیے تڑپتا رہ جاتا ——— وہ اب ملکہ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

تنہائی کے اداس لمحوں کی شدّت سے اس کا سر گھوم جاتا اور وہ دھیان ہی دھیان میں

ملکہ شبر وزی کے برہنہ جسم کی اُٹھانیں چومتا، گولائیاں چاٹتا، ایک ایک عضو پر بوسے دیتا ——— آخر اسے دھیان کی دُنیا سے لوٹنا پڑتا۔ اس کا جسم اینٹھ اینٹھ کر ٹوٹ چکا ہوتا۔

اب اس کے نغمے ملکہ کے حسن کا چرچا تھے لیکن ملکہ شبر وزی نے کبھی وہ مرحلہ آنے ہی نہ دیا کہ وہ نغمے گوش گزار کر سکتا۔ وہ ہمیشہ کام کاج کی زیادتی کے بہانے ٹل جاتی اور تلقارمس شکست خوردگی کے احساس میں ڈوب جاتا۔

ایک شب انھیں شہر نوردی کے لیے نکلنا تھا ——— ملکہ نے دربار میں بنا اس کی طرف دیکھے اسے کہا تھا ——— وہ ملکہ کو ساتھ لینے کے واسطے گیا۔ ملکہ اسے کہیں دکھائی نہ دی۔ کہیں کوئی کنیز بھی نظر نہ آرہی تھی کہ پوچھ پاتا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ ملکہ کے انگ انگ کا لباس قدم قدم بکھرا پڑا تھا ——— اس کے رُکتے بڑھتے بے قابو قدم اسے حمام تک کھینچ لے گئے۔

ملکہ شبر وزی حمام کے چوبچے میں برہنہ بدن نہا رہی تھی ——— اس کے پاؤں پتھر ہو گئے۔ وہ جہاں رک گیا تھا، وہیں کا ہو رہا ——— وہ جسم جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اس جسم سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا جسے اس نے اپنے دھیان میں چوما تھا، چاٹا تھا اور جس کے ایک ایک عضو پر ہزار ہزار بوسے دیے تھے۔

وہ کب تک وہاں کھڑا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

چونکنے کے بعد وہ اپنے آپ میں آیا تو ملکہ شبر وزی کہہ رہی تھی: "وزیر اعلیٰ اور ملکہ کے حمام میں؟ کیا یہ مناسب ہے ۔ ۔ ۔ ؟"

وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ملکہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عجیب شرارت بھری مسکراہٹ تھی ملکہ کے چہرے پر۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ پشیمانی میں اس نے نظریں نیچی کر لیں۔

ملکہ نے ہلکا سا قہقہہ اس کی طرف اچھال دیا اور ——— تلقارمس نے ملکہ کو انگ انگ لباس پہنتے دیکھا۔

کپڑے پہن، بَن سنور وہ باہر نکل گئی ——— وہ لپکا۔ دونوں محل کی غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے بڑے دروازے کے راستے باہر نکل گئے۔

اس رات ملکہ کے قدم شہر کی طرف نہ اُٹھے۔ وہ کھجور کے جنگل سے ہو کر مرحوم عابد کے ویران گھر کی طرف نکل گئی۔ تلقارمس سائے کی طرح ساتھ لگا رہا۔

ان کے قدموں کی آہٹ سے قرطونی کے پیڑ پر ایک چیل چیخی اور آسمان کی سمت اُڑنے لگی۔

ملکہ شبروزی مارے خوف کے تلقارمس کی باہوں میں آن گری اور گہرے لمبے سانس لینے لگی ——— سانس درست کرنے کے بعد ذرا مچلتے ہوئے باہوں کے حلقے سے نکلنے لگی تو تلقارمس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "میں مر جاؤں گا شب . . ."

کیا ہوا میرے محترم وزیرِ اعلیٰ؟"

"نہیں . . . نہیں . . . وزیرِ اعلیٰ نہیں . . . خادم، تمہارا خادم . . ."

ملکہ شبروزی کا ہلکا سا قہقہہ فضا میں گونج پیدا کر گیا ——— تلقارمس کو محسوس ہُوا چیل پھر چیخی ہے، لیکن نہیں . . .

"شبروزی . . ."

"مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"شب رو . . ."

صلہ کیا دو گے؟"

"تمہارا حکم شبروزی، تمہارا حکم . . ."

"دُنیا میں سب سے زیادہ کیا عزیز ہے تمہیں . . . میرے علاوہ؟"

"ماں اور غیاب . . ."

"مَیں غیاب مانگ کر تمہارے دل پذیر نغمے نہیں چھیننا چاہتی جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں . . . کیا تم میرے لیے اپنی ماں کا دل نکال کر لا سکتے ہو؟"

"کیا . . . ؟" تلقارمس چونکا اور اس کی باہوں کا حلقہ کُھل گیا۔

"زندگی میں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے . . . جس دن یہ بات سمجھ میں آجائے، چلے آنا . . . !" ملکہ شبروزی نے کہا اور تیزی سے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

تلقارمس جب اپنے گاؤں کے قریب پہنچا۔ گہری سیاہ رات میں سب کچھ ڈوب چکا تھا۔

گاؤں کے باہر کا ٹیلہ شیشم کے درخت، مکی کی کھیتیاں، کپاس کے پودے، پگڈنڈیاں، کنواں اور انکے کچے مکانوں میں اسکا اپنا مکان جہاں ایک بوڑھی فرشتہ سیرت عورت اپنے خاوند کی رُوح کے سکون کی خاطر اور اپنے بچے کی کامیابی اور شادمانی کے لیے تسبیح کے دانے گنتے گنتے سو گئی تھی۔

تلقارمس اور اس کا گھوڑا پسینے میں بھیگے ہوئے تھے اور بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ گہری سیاہ رات میں گھوڑا عین ہمارے گھر کے سامنے رکا تو مکان کے اندر سے آواز آئی: "آئی میرے بچے! میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔۔۔"

تھکے ہارے تلقارمس کو ماں کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا ـــــ جب اس نے چوکھٹ کے اس طرف آنگن میں قدم رکھا، اسے محسوس ہوا، وہ رحمتوں کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

ماں نے دروازے کے باہر ہانپتے ہوئے گھوڑے کو دیکھا، تھکے ہارے بیٹے کو دیکھا ـــــ غیاب کہیں نظر نہ آیا تو چپ چاپ سر جھکائے اس کمرے میں گئی جس میں چراغ روشن تھا۔

ماں اور بیٹے دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔

ماں نے دسترخوان بچھایا اور اس پر دنیا کی نعمتیں چُن دیں۔ پانی سے بھری صراحی قریب ہی رکھنے کے بعد وہ باہر چلی گئی ـــــ گھوڑے کے سامنے چارہ ڈالا اور پانی سے بھرا بڑا سا آب خورہ رکھا۔

تلقارمس کھانے سے فارغ ہُوا تو اس نے دیکھا، نرم اور آرام دہ بستر لگا ہُوا ہے۔ بستر پر پڑتے ہی اسے نیند آگئی ـــــ خواب میں اس نے ملکہ شبروزی کے ساتھ جماع کیا۔ صبح دیر بعد اس کی آنکھ کُھلی تو اس نے خود کو تازہ دم پایا ـــــ گھوڑا بھی تازہ دم تھا۔

رات آئی اور جب وہ سونے کی تیاری کرنے لگا تو ماں نے ایک آب دار خنجر اس کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا: "لوہا سرہانے رکھ کر سوئیں تو بُرے خواب نہیں آتے۔۔۔"

تلقارمس کانپ اٹھا۔

نیند کوسوں دُور تھی ـــــ آدھی رات ہوئی تو اسے ماں کے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ سرہانے سے خنجر اُٹھا کر اندھیرے میں ماں کی طرف بڑھا۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں

سے ماں کی بائیں چھاتی ٹوٹی اور دائیں ہاتھ سے خنجر کا بھرپور وار کیا۔ "اللہ تمہاری مرادیں پوری کرے۔۔۔" ماں کے منہ سے دعا نکلی۔

اُجانیر کی طرف منہ کیے صحرا میں سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی باگ تلقارمس کے دائیں ہاتھ میں تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک تھیلی تھی جس میں اس کی ماں کا دل تھا جو ابھی تک دھڑک رہا تھا ——— شہر کے قریب پہنچتے پہنچتے تڑکا ہو گیا۔ ایک نالہ پھلانگتے ہوئے گھوڑا بے دم ہو گیا یا تلقارمس توازن کھو بیٹھا، دونوں نالے کے اس طرف دھڑام سے جا پڑے۔ تلقارمس سنبھل کر اٹھنے لگا تو قریب ہی گری پڑی تھیلی سے ماں کے دل کی آواز آئی: "میرے بچے! کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔۔۔"

تلقارمس کا دل درد سے بھر گیا اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

تلقارمس اور ملکہ شبروزی کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ دُور نزدیک کے ملکوں کے بادشاہ، شہزادے اور شہزادیاں، سب شادی میں شریک ہوئے ——— رات سیاہ تھی مگر شہر میں وہ چراغاں ہُوا کہ رات دن سے اُجلی اور روشن ہو گئی، برسوں کی جمع کی ہوئی چربی صرف ہو گئی۔ تمام جانور دعوتوں کی خاطر ذبح کر دیے گئے۔ نان حلوے کے لیے سرکاری مال خانے کا دانہ دانہ کام آگیا۔ در و دیوار اس طور سجائے گئے کہ نخلستان کے تمام پیڑ ٹنڈ منڈ ہو گئے۔ مہمانوں کو اتنے تحائف دیے گئے کہ سرکاری خزانہ خالی ہو گیا ——— اور شبِ وصل کے لیے ایسا حجلۂ عروسی بنایا گیا کہ چمن میں ایک پھُول تک نہ رہا۔

شبِ وصل کے بعد کی صبح تلقارمس نے مہمانوں کی موجودگی میں اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ذرا کاٹ کر اور اپنے خون میں رنگ کر دستور کی کتاب کی جلد پر لگایا ——— اس رسم کے بعد مہمان رخصت ہوئے تو شہر اُجانیر ایک لُٹا ہوا شہر تھا اور ——— اور اس شہر کا بادشاہ مغنی تلقارمس تھا۔

پہلے تو وہاں قحط پڑا، پھر وبا پھوٹ پڑی اور دریائے نیل کے کنارے فرشتے کی طرح کھڑا شہر اُجانیر زخمی نڈھال اور معمر نظر آنے لگا۔

سرکاری اور شاہی اخراجات پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے محصول لگائے گئے۔ لوگ یہ سوچ سوچ کے حیران اور پریشان تھے کہ یہ سب اس شخص کے حکم سے ہو رہا ہے جس نے انھیں ظالم جنبل سے نجات دلائی تھی۔ اور اس بات پر بھی متحیر تھے کہ ان کے چُنے ہوئے تیرہ نمائندوں

پر مشتمل مجلسِ مشاورت کو کیا ہُوا؟

مجلسِ مشاورت تو اسی دن ٹھکانے لگا دی گئی تھی جس دن ملکہ شبروزی کی فرمائش پر تلقارمس اپنی ماں کا دل نکالنے کیلئے روانہ ہُوا تھا۔ مشیروں کی جگہ ان کے مجسّمے نشستوں پر رکھ دیے گئے تھے۔ مجسّموں کی گردنیں بانس کی کھپچیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہوا چلتی تو گردنیں اس طرح ہلتیں گویا حامی بھر رہی ہوں۔

تلقارمس تو پہلے ہی ملکہ شبروزی کے جسم کی چاہت میں تڑپ تڑپ کر دل و دماغ کھو چکا تھا، اب تو اسے وہ جسم مہیا تھا اور وہ اس جسم میں بُری طرح غرق ہو چکا تھا۔

اور اب ملکہ شبروزی اسی طرح مَن مانی کر رہی تھی جس طرح وہ بادشاہ بازفادی اور سپہ سالار جفیل کے زمانے میں کرتی تھی۔

اور عوام سوچ سوچ تھک ہار بیٹھے: اُن کے مقدر میں یہی کچھ ہے۔ اللہ کو یہی منظور ہے حکومت کے عمل دخل میں ہم لوگوں کی تکلیف کے کوئی معنی نہیں۔ ۔ ۔ وگرنہ اپنا مغنی تلقارمس غیاب کی دُھن پر وہ نغمہ چھیڑتا کہ محلوں کی دیواریں کانپ اُٹھتیں۔

خدا خدا کر کے ایک برس بیتا۔ ٹنڈ منڈ پیڑوں پر پھر سے پتیاں نظر آنے لگیں۔ نخلستان میں پودوں کے دامن کونپلوں سے بھرنے لگے۔ کھیتوں میں پھر سے خوشے سر اٹھانے لگے۔ اُجانیر کی فضا پھر سے پُر امید نظر آنے لگی۔ تاجروں کے قافلے اور کارواں پھر سے ادھر اُدھر کا رُخ کرنے لگے اور پھر سال کا سب سے بڑا بازار لگنے کی تیاری شروع ہوئی ——— اس بار دریائے نیل کا پانی مٹیالا تھا اور اس کا بہاؤ بھی تیز تھا۔

امیر فرید ابنِ سعید کا بھانجا قاسم بن ہُدا تاجروں کے سب سے بڑے قافلے کا سالار تھا۔ اس کا قافلہ اُجانیر کا رُخ کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے مرحوم ماموں کی قبر پر دعا بھی پڑھنا چاہتا تھا۔

قافلے شہر کے صدر دروازے کے باہر فصیل کے ساتھ ساتھ اترنے لگے۔ قاسم بن ہُدا کا قافلہ بھی وہیں اُترا۔

اس رات قاسم بن ہُدا کے حکم سے بہت بڑا الاؤ جلایا گیا ——— الاؤ کے گرد لوگ اکٹھا ہوئے تو قاسم بن ہُدا نے غیاب سنبھالا اور غلاموں کا نغمہ چھیڑ دیا (یہ قاعدے کے خلاف تھا)۔

تیرا شکریہ!

تیرا شکریہ!

چاند محل کی محراب کے اوپر تھا اور الاؤ کے گرد لوگ دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔

ملکہ شبروزی کے حکم سے محل کی کھڑکیاں اور سب دروازے بند کر دیے گئے کہ آواز منتظر کانوں تک راہ نہ پا جائے۔

تلقارس نشے میں تو تھا مگر ابھی اس نے ہوش و حواس نہیں گنوائے تھے ——— نیم برہنہ سی ملکہ شبروزی تلقارس کے رُوبرو کچھ اس طور آن کھڑی ہوئی، جسم کو خم دیے ہوئے کہ اس کا حلق سوکھ گیا، لب خشک ہو گئے اور خشک لبوں پر سوکھی زبان پھرنے لگی ——— نیم برہنگی سے برہنگی تک پہنچتے پہنچتے ملکہ شبروزی نے جیسے زمانے گزار دیے۔ پھر اس نے بڑھ کر بھرپور جام بنایا اور جام تھامے تلقارس کے سامنے دراز ہو گئی۔ چند ہی ساعتوں کے بعد ایک ہاتھ سے اس نے جام اپنے گول، رس بھرے، نوکیلے پستانوں کے بیچ تھام کر دوسرے ہاتھ کی انگلی جام میں ڈبو کر، بھگو کر پستانوں کی مُرجھائی ہوئی کلیاں تر کیں۔ کلیاں جیسے جاگ گئیں ——— اس رات ملکہ شبروزی اپنے جسم کے ہر حصے پر جام کے جام لنڈھاتی رہی اور تلقارس ملکہ شبروزی کے جسم سے قطرہ قطرہ شراب پیتا رہا ——— وہ بہت مسرور تھا۔ اس کا دل مسّرت سے بھر گیا: اس سے زیادہ سکون بھلا زندگی میں اور کہاں ملے گا؟ اور بے اختیار اس کے مُنہ سے نکل گیا: تیرا شکریہ!

قاسم بن عبداستی کے عالم میں غیاب بجاتا ہُوا گا رہا تھا۔ الاؤ کے گرد لوگ دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔

تیرا شکریہ!

تیرا شکریہ!

تلقارس کی آغوش میں ملکہ شبروزی کا سونے میں ڈھلا ہُوا جسم تھا۔ سارے میں دھند لکا تھا۔ دُور ایک کونے میں مدھم سی قندیل جل رہی تھی ——— اس نے ایک بار پھر ملکہ شبروزی کے پستانوں کی رس بھری کلیوں سے شراب پی ——— پھر وہ چونک اُٹھا۔ اسے محسوس ہُوا، ساتویں آسمان سے کوئی آواز اس تک پہنچ رہی ہے۔

تیرا شکریہ!

ملکہ شبر وزی کے جسم کی شراب میں تلقارمس ڈوب چکا تھا۔

صبح ہوئی تو ملکہ شبر وزی، وزرا اور امرا کے ساتھ تاجروں کو خوش آمدید کہنے شہر کے صدر دروازے پر پہنچی۔

قاسم بن ہدا اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے غلام تحائف لیے کھڑے تھے۔ قاسم بن ہدا کو تلقارمس دکھائی نہ دیا تو اس نے بلند آواز میں کہا: "ملکہ محترمہ! رسم کے مطابق اجانیر کے بادشاہِ وقت کو ہی ہمیں خوش آمدید کہنے آنا چاہیے۔ آپ اپنے خاوند کے حق میں دست بردار ہو چکی ہیں۔ اس لیے سال کے سب سے بڑے بازار کی رسمِ افتتاح کے لیے آپ کا تنہا آنا نیک فال نہیں...!"

امرا اور وزرا سب گھبرا گئے لیکن ملکہ شبر وزی نے بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "اے امیر! تم نے ٹھیک کہا... لیکن بادشاہ کی علالت کے سبب مجھے تنہا آنا پڑا... میں نے اپنے مہمانوں کا بے سبب شہر کی فصیل کے باہر رُکے رہنا مناسب نہ سمجھا..."

قاسم بن ہدا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "نہیں ملکہ محترمہ! ہم تاجر جہاں اتنے دنوں سفر کی صعوبتیں جھیلتے رہے ہیں، وہاں ہم بادشاہ تلقارمس کے صحت یاب ہونے کا انتظار بھی کر سکتے ہیں۔"

ملکہ نے فوراً جواب دیا: "اگر امیر کی یہی خواہش ہے اور بادشاہ کا آنا اتنا ہی ضروری ہے تو بادشاہ تک ابھی پیغام بھجواتی ہوں..."

ملکہ کے محافظ محل کی طرف لپکے اور تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے نشے میں دُھت بادشاہ تلقارمس کو ملکہ شبر وزی کی بغل میں لا کھڑا کیا۔ وہ کھڑا ابھی نہ ہو پا رہا تھا ــــــ قاسم بن ہدیٰ کا ماتھا ٹھنکا۔

تمام رسومات ادا ہوئیں اور تاجر تجارت کے سامان سے لدے اونٹوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے ــــــ اور شہر کے بازاروں میں گزشتہ سال کی طرح چہل پہل نظر آنے لگی۔

سورج غروب ہونے سے پہلے قاسم بن ہدا اپنے ماموں کی قبر پر دعا پڑھنے گیا ــــــ فرید ابن سعید، عابد، یوسف، تینوں کے لیے دعا پڑھنے کے بعد اس نے تعظیم سے سر جھکا کر سجدہ کیا تو تینوں قبروں کے سینے شق ہو گئے ــــــ قاسم بن ہدا اس بشارت کا مطلب سمجھ گیا

کہ مرحومین کی روحیں انتقام چاہتی ہیں۔

اس نے جلدی سے قبروں کی دراڑیں مٹّی سے بھر دیں کہ کسی کو اس بشارت کا علم نہ ہو۔

ملکہ شبر وزی نے شہر کا صدر دروازہ تا حکم ثانی بند کر دینے کا حکم دے دیا تھا کہ وہ قاسم بن ہُدا کی نیت جان سکے۔ اسے قاسم بن ہُدا کی صبح کی گفتگو سے نفرت کی بُو آتی محسوس ہوئی تھی۔

آدھی رات کے بعد ملکہ، تلقارس کی نشے میں ڈوبی ہوئی گرفت سے نکلی اور لباس زیب تن کرنے کے بعد اپنے مخصوص حجرے میں مُخبر کا انتظار کرنے لگی ـــــ مُخبر نے اطلاع دی کہ قاسم بن ہُدا کسی اور ہی ارادے سے اجانیر میں وارد ہُوا ہے، اس کے سامانِ تجارت میں اور چیزوں کے مقابلے سب سے زیادہ تعداد سامانِ حرب کی ہے اور اس کے غلاموں میں زیادہ تر غلام ماہرِ حرب ہیں۔

شہر میں چہل پہل تھی۔ رنگارنگ سامان کے ساتھ وقت کا سب سے بڑا بازار لگ رہا تھا۔ تاجر اور خریدار ابھی سودے بازی میں مصروف تھے کہ سرکاری منادی کی آمد ہوئی ـــــ نقارہ پٹا تو لوگ متوجہ ہوئے اور منادی سرکاری اعلان پڑھنے لگا:

ملک خدا کا، حکم بادشاہ کا: اطلاع برائے ہر خاص و عام۔ حاکم مقامی اور غیر مقامی تاجرین کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اُن کی جان و مال کی حفاظت کا یقین دلاتا ہے ـــــ یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ متواتر بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات اور ملک پر پڑنے والی آفتوں کے پیشِ نظر آج سے اشیا کی خرید اور فروخت، دونوں پر دونوں طرف سے پانچ پانچ فیصد محصول وصول کیا جائے گا ـــــ یہ اطلاع بھی دی جاتی ہے کہ سرکاری خزانے کی غیر تسلی بخش حالت کے پیشِ نظر اب تاجروں کو قرض نہ دیا جا سکے گا ـــــ بادشاہ کی نیک خواہشات خدا کے سب بندوں کو پیش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کے چہرے اعلان سُن کر فق ہو گئے ـــــ انھوں نے شہر کے مرکزی دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔

سرائے کے ایک بڑے کمرے میں قاسم بن ہُدا چھوٹی چھوٹی توپوں کے الگ الگ حصّوں کو احتیاط اور حفاظت سے قطار میں رکھوا رہا تھا کہ اس قافلے کے کچھ تاجر گھبرائے ہوئے آئے اور اسے سرکاری اعلان کی اطلاع دی۔

قاسم بن ہُدا نے بازار بند کر دینے کی ہدایت دی اور اپنے جانبازوں کو الگ الگ حصے جوڑ کر توپیں تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور پھر کمر کے ساتھ تلوار باندھ کر سولہ جانبازوں کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہُوا۔

وہ بازار میں سے ہوتے ہوئے محل کی طرف جانے والی سڑک کی طرف مڑے ہی تھے کہ انھیں محل کی فصیل کے ساتھ ساتھ گھوڑ سوار مسلّح سپاہ آتی دکھائی دی۔

قاسم بن ہُدا کا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر جا پڑا۔ اس نے جانبازوں کی طرف دیکھا۔ سب کے ہاتھ تلواروں کے دستوں پر تھے —— وہ بڑھتے رہے —— گھوڑ سوار سپاہ سے ان کا سامنا ہوا تو سپاہ نے انھیں گھیر لیا اور اطلاع دی کہ وہ بادشاہ تلقارمس کے حکم سے حراست میں ہیں، اس لیے وہ اپنی تلوار سپاہ کے حوالے کر دیں۔

قاسم بن ہُدا نے کڑک کر کہا: "خبردار . . . ! ہم خود بادشاہ تلقارمس سے ملنے جا رہے ہیں۔"

گھوڑ سوار سپاہ کی ٹکڑی کے سالار نے قاسم بن ہُدا کے غیض و غضب کو دیکھا تو وہ ٹھٹک گیا —— اس نے سپاہ کو حکم دیا کہ قاسم بن ہُدا اور اس کے رفیقوں کو نرغے میں لے کر وہ محل کی طرف بڑھیں۔

قاسم بن ہُدا سولہ جانبازوں کے ساتھ دربار میں داخل ہُوا۔ اس نے دیکھا —— بادشاہ تلقارمس سر لٹکائے تخت پر بیٹھا ہُوا تھا اور اس کے دائیں طرف دوسرے تخت پر ملکہ شبروزی بھڑک دار لباس میں بیٹھی ہوئی تھی —— مشیروں کی نشستوں پر منڈیاں ہلاتے ہوئے مٹی کے مجسّمے رکھے ہوئے تھے۔

قاسم بن ہُدا نے میان میں سے تلوار کھینچ لی اور اونچی آواز میں کہا: "جس ملک کا شاہی دربار سازشوں کا مسکن ہو، جہاں ایک مغنّی بادشاہ بن جائے اور شراب اور حُسن کے چہچہوں میں غرق ہو جائے، جہاں مٹی کے مجسّمے حکومت کے مشیر ہوں، اس ملک سے انصاف اور صداقت کمبل اوڑھ راتوں رات چپکے سے رخصت ہو جاتے ہیں . . ."

بادشاہ تلقارمس جوں کا توں سر لٹکائے بیٹھا رہا۔ ملکہ شبروزی نے قاسم بن ہُدا اور اسکے رفیقوں کی طرف دیکھا اور مخبر کی بات کو دھیان میں لاتے ہوئے بظاہر تحمّل سے مخاطب ہوئی: "اے

نڈر اور خوبصورت نوجوان! تمہاری تلوار اور تمہارا اندازِ گفتگو؟ ہم متاثر ہوئے۔۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔۔۔ جو شاہی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اسے دستور کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔۔۔ تم ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ہم محصول کے سلسلے میں غور کر سکتے ہیں۔۔۔ اور تمہیں معززِ مہمان کے طور پر محل میں اپنے ساتھ ایک رات بسر کرنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔۔۔ تلوار میان میں رکھو اور ہماری دعوت قبول کرو۔۔۔" ملکہ کی آواز میں لپک تھی۔

قاسم بن ہُدا نے حقارت سے پوچھا: "یہ ایک ملکہ کے الفاظ ہیں؟"

"ہاں۔۔۔! ملکہ شبروزی ان الفاظ میں تمہیں دعوت دے رہی ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔! ملکہ شبروزی نہیں، ایک بازاری عورت۔۔۔"

"قاسم۔۔۔" ملکہ شبروزی چلائی: "۔۔۔ بادشاہ کے قہر سے ڈرو۔۔۔ ہمارے ملک کے دستور سے ڈرو۔۔۔ تمہارا خوبصورت جسم بوٹی بوٹی کتوں کے آگے ڈال دیا جائے گا۔۔۔"

"بادشاہ۔۔۔؟ پرانے وقتوں کا آتش بیان مغنّی تلقارمس؟ جس نے نغموں کا گلا گھونٹ ڈالا، آدمیوں اور آدمیت سے رشتہ توڑ لیا؛ جو اپنا غیاب ایک بدکار عورت کی فرج میں بھول بیٹھا؛ اُس بادشاہ کا قہر۔۔۔" قاسم ذرا رُکا اور پھر چیخ پڑا: "میں اس دستور کی کتاب کو نہیں مانتا جس کی جلد پر خون کے نشانات ہیں۔۔۔" اور اسی لمحے اس نے قریب ہی چوکی پر رکھی ہوئی دستور کی کتاب پر ننگی آب دار تلوار کا بھرپور وار کیا ـــــ دستور کی کتاب دو ٹکڑے ہو کر فرش پر جا پڑی۔

ملکہ شبروزی کانپنے لگی اور پوری قوت سے چلائی کہ قاسم اور اس کے رفیقوں کے سر کاٹ کر شہر کے مرکزی دروازے کے باہر لٹکا دیے جائیں کہ آنے والی نسلوں کو عبرت حاصل ہو۔

بیشتر اس کے کہ سپہ سالار اور سپاہ قاسم بن ہُدا اور اس کے جانبازوں کی طرف بڑھتی، دربار میں گھمسان کا رَن پڑنے لگا۔

ملکہ شبروزی گھبرا گئی اور کھسک گئی ـــــ بادشاہ تلقارمس سر لٹکائے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

شہر کی سرائے کی چھت سے توپیں دغنے لگیں ـــــ ان کا رخ محل کی طرف تھا۔

لوگ تلواریں، نیزے اور پتھر لیے محل کی طرف بڑھنے لگے ـــــ سپاہ کا قلع قمع ہونے لگا۔

سورج ڈوبتے ڈوبتے محل کی فصیل میں شگاف پڑ چکے تھے ——— خون کی ندی دریائے نیل کے چاندی جیسے سیال کی طرف بڑھ رہی تھی۔
آسمان کی رنگت بتدریج سُرخ ہونے لگی اور پھر تیز آندھی اُٹھی اور سارے شہر میں اندھیرا ہوگیا۔ پھر آسمان پر رعد کڑکی اور اس لمحے لوگوں نے دیکھا، ملکہ شبروزی محل کی چھت پر محراب کی منڈیر پر کھڑی ہے . . .
پھر گھروں سے اُٹھتا ہوا دھواں تھا، اونٹوں کی لاشیں تھیں، خون کی ندی تھی اور شہر کی بربادی۔
تلقارمس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اسے محسوس ہوا، وہ تخت پر بیٹھا ہُوا ہے اور وہ اور تخت سیاہی اور سناٹے کے نرغے میں ہیں۔ گرتا پڑتا نرغے میں سے نکلا تو آسمان پر رعد کڑکی اور اس نے دیکھا: وہ تھا اور کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔
"میں کہاں ہوں خداوند . . . ؟" اس نے پکارا ——— اور پھر اس نے سُنا:
شبروزی اندھی قوت کا استعارہ ہے۔ جو کوئی اسے کنیز بنانے کی کوشش کرتا ہے، خود اس کا اسیر بن جاتا ہے . . . اب تو تنہا ہے . . . پتھروں پر اپنی بدکرداری اور بداعمالیوں کی داستان لکھ کہ یہی اب تیری زندگی ہے . . . تجھے یاد ہے، تھیلی میں رکھے ہوئے ماں کے دل کی آواز سُن کر تو بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ تیرے وہی آنسو تیری نجات کا سبب ہیں۔ تو غیاب کھو بیٹھا، اب یہ لمحہ مت کھو! اور پتھروں پر اپنے غیاب بجانے والے ہاتھوں سے لکھ دے یہ داستان . . .
تلقارمس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا: تیرا شکریہ! تیرا شکریہ!!
——— اور پتھروں کی چھاتی پر داستان رقم کرتے کرتے تلقارمس کھنڈروں میں کھنڈر ہوگیا ———

——— اور جب کبھی ان کھنڈروں کے قریب سے تاجروں کے قافلے گزرتے ہیں، کبھی کبھی انھیں کسی کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ اپنے اونٹوں کی رفتار تیز کر لیتے ہیں۔
"کمال کی داستان ہے . . . !" میری بیوی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی نظریں مسودے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری سانس لی — میں کچھ نہ کہہ سکا، آنکھیں موندے سوچ میں غرق رہا۔ نجانے کیوں اور کب میں نے پوچھا: "اگر یہ داستان کسی ایسے شخص نے لکھی ہے جو آج ہمارے زمانے میں بھی زندہ ہے تو وہ کون ہو سکتا ہے؟"

نجانے کب تک میری بیوی سوچتی رہی۔ آخر اس نے جواب دیا: "کرشن چندر..!"

"نہیں!"

"خواجہ احمد عباس... احمد ندیم قاسمی..."

"نہیں!"

"رام لعل... جوگندر پال..."

"نہیں!"

"انور عظیم..."

"نہیں!"

"تو پھر کون ہو سکتا ہے...؟" میری بیوی نے آخر تھک ہار کر مجھ سے سوال کیا۔

میں نے ایک نظر بیوی کو دیکھا اور پھر قریب بیٹھے ہوئے بچوں پر نگاہ ڈالی۔ جو انہماک سے داستان سننے کے بعد چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔

"خاموش کیوں ہو گئے...؟ بولو نا، کون ہو سکتا ہے؟"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا: "میں! تلقار میں میں ہی تھا... یہ داستان میں نے ہی لکھی تھی..."

میری بیوی سہم گئی۔ اس کا چہرہ مارے خوف کے زرد پڑ گیا۔ آنکھیں بجھ گئیں — اس نے بچوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر چھاتی سے لگا لیا۔

وہ بمشکل کہہ سکی، "کیا میں پچھلے بیس برس سے ہزاروں برس پرانے بھوت کے ساتھ زندگی گذار رہی ہوں..."

آرٹ گیلری

وہ حسب معمول سیڑھیوں پر بیٹھا بڑبڑا اپنے آگے پیچھے۔ دائیں بائیں بھاگتی سڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بارش کا ایک طوفانی ریلہ آچکا تھا اور ہر چیز بھیگ گئی تھی ــــــ اس سے کچھ عرصہ پہلے مطلع صاف تھا اور سامنے والی سڑک پر سے ایک جلوس گزرا تھا ــــــ لوگ چلا چلا کر نعرے لگا رہے تھے۔

اس نے جلوس دیکھ کر ایک انگڑائی لی تھی اس کے ساتھ ہی اسے ابکائی آگئی تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے حلق میں سے عجیب و غریب قسم کی آواز نکالی تھی۔ وہ اس آواز پر خود بھی حیران ہوا اٹھا تھا جب راستہ چلتے ایک آدمی نے جلوس میں اٹھایا ہوا ایک ماٹو پڑھتے ہوئے اس کی ابکائی کی آواز سنی اور پلٹ کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر ماٹو پڑھے بغیر ہی اپنے راستے پر چل دیا تھا۔

اس نے اپنے سامنے والی بھیگی ہوئی سڑک پر دیکھا اب وہاں کچھ نہ تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی اور لوگ بلا مقصد یا کسی مقصد کے تحت اُس پر چل پھر رہے تھے۔

اسے یاد آیا ــــــ اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے اُس نے ایک اور جلوس دیکھا تھا ان لوگوں کے لباس اور وضع قطع بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ دوسرے جلوس والوں کی اُن کے ہاتھوں میں بھی ماٹو پکڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی چلا چلا کر نعرے لگا رہے تھے۔

وہ حیران ہوا۔ کہ وہ نعرے اور یہ نعرے اب کسی جگہ موجود نہیں ہیں۔ فضا میں ابھر کر اپنے وجود کا ماتم منا کر قبرستان کی سوکھی گھاس کے ساتھ جل گئے ہیں۔ اور پھر بڑے زور سے بجلی چمکی تھی تیز ہوا اور بارش کا ایک زوردار طوفانی ریلہ ــــــ

جو ابھی ابھی ختم ہوا تھا ـــــــ لیکن وہ بدستور سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اندر کیفے میں گپ بازی زوروں پر تھی۔ اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے لوگ، کیفے کی مالکن کے چہرے کو جس پر ابھی تک اس کی جوانی اور حسن کے آثار باقی ہیں، نہار رہے تھے۔

اسے جن کا انتظار تھا، وہ آ گئے ـــــــ انھوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور اپنے چھاتے بند کر کے ہاتھ میں الٹے پکڑ لیے۔ اور پھر سیڑھیاں عبور کر کے ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ان کے چھاتوں میں سے پانی کی بوندیں ٹپک کر چکنے فرش پر ایک لکیر بناتی ہوئی پھیل گئیں اور انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی ـــــــ کہ وہ کسی بہت ہی اہم مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے گزر گئے تھے۔ ان کی بے توجہی اور گفتگو دونوں چیزیں اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ سوائے اس ایک جملہ کے جو ان میں سے ایک کے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔

"یار زندگی سات بٹہ انیس ہو کر رہ گئی ہے!"

پہلے اس نے سوچا یہیں بیٹھا رہے۔ اگر انھوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تو وہ اُن کے پیچھے کیوں بھاگے؟ ـــــــ اتنی زندگی یونہی سیڑھیوں پر گزر گئی ہے باقی بھی کٹ جائے گی ـــــــ لیکن اچانک اسے چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی اور کیفے کی مالکن کا خوبصورت چہرہ اس کے ذہن میں گھوم گیا ـــــــ لہٰذا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فرش پر پھیلے ہوئے پانی کے قطروں کے نشانوں پر چلتا ہوا کیفے میں پہنچ گیا ـــــــ

حالانکہ وہاں چھت تھی۔ پھر بھی اسے ہر چیز بھیگی بھیگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیفے کی مالکن کی چمکدار آنکھیں، خوبصورت چہرہ، پتلے پتلے خمدار ہونٹ اور اس کے وہ دوست جو اس کے قریب پہنچ کر چھاتے بند کر کے اندر آ گئے تھے۔

وہ ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ایکدم سب کے چہروں پر خوف کا رنگ پھیل گیا ـــــــ جیسے انھوں نے بھوت دیکھ لیا ہو وہ سر جھکا کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

" چائے ؟" ـــــ اس نے پوچھا جس نے کہا تھا کہ زندگی سات بٹہ انیس ہو کر رہ گئی ہے۔
" ہاں! اور کچھ کھاؤں گا بھی " اس نے دبی زبان سے کہا۔
" نہ کھاؤ تو بہتر ہے ـــــ کہ ہر چیز کے دام بیالیس فی صد بڑھے ہوئے ہیں " فرید نے کہا ـــــ
" بھوک بہت لگی ہے " اس نے فرید سے آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا۔
" تو ایسا کرو اسے کوئی ایسی چیز منگوا دو جس سے اِس کی بھوک اٹھائیس فی صد مٹ جائے " کبیرؔ نے مشورہ دیا۔
فرید نے مینو کارڈ دیکھ کر ویٹر کو آرڈر دے دیا۔ بغیر اُس سے کچھ پوچھے، جیسے اُس کی رائے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔
" میں اب کی نمائش میں اپنی تصویروں کی قیمتیں ایک سو بارہ فی صد بڑھا رہا ہوں " وزیر نے اپنی ٹھوڑی پنجے پر جماتے ہوئے اطلاع دی۔
" ٹھیک ہے ـــــ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے ـــــ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر! " فقیرؔ نے پانی کا خالی گلاس میز پر رکھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے ہونٹ پونچھتے ہوئے وزیر سے اتفاق کیا۔
ویٹر چائے اور کھانے کی چیزیں لے آیا تھا۔ اس نے خالی گلاس سمیٹ کر نئے برتن میز پر سجا دیئے۔ چائے بنی اور سب نے چسکیاں لینا شروع کیا ـــــ اس نے چمچ سے ایندھن منہ میں ڈالا اور پھر سب کی طرف دیکھا۔ سب بھیگا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔

رتن کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ جمائے جھکا ہوا کیفے کی مالکن سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا مسکرا کر رتن کے ساتھ گفتگو میں محو تھی۔
" وقت کے ساتھ ساتھ آدمی بھی کیسے بدل جاتا ہے "، کبیر بولا۔
" کیوں۔ کیا ہوا؟ " فرید نے پوچھا۔
" رتن کا سرکش کردار ختم ہو گیا ہے۔ وقت کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے یہی رتن کیفے

کی مالکن کے باپ کے ساتھ کیسے بھڑ گیا تھا۔ ہم سب نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ہم سب کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور بے شمار کرا کری توڑ دی تھی!" کبیر نے بتایا۔

" آخر بات کیا ہوئی تھی؟" وزیر نے پوچھا۔

" کیفے کی مالکن کے باپ نے ایک تختی لگا دی تھی جس پر لکھا تھا ـــــ گفتگو آہستہ کیجیے" رتن نے تختی دیکھی تو بھڑک اٹھا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ ہم سب بھی بپھر گئے۔ آخر کیفے کی مالکن کے باپ کو مجبور ہو کر وہ تختی ہٹانا پڑی۔ اور جب تک وہ زندہ رہا۔ رتن اور ہم اس کے ساتھ سپیکنگ ٹرمز پر نہیں رہے۔ بس یہ کیا کہ اس کے جنازے میں شامل ہوئے۔ اور اگلے دن جب اس کی لڑکی نے آکر کونٹر سنبھالا تو سب اس کے حسنِ توبہ شکن کو دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔ زبانیں شل ہو گئیں اور جسم بے حرکت ہو گئے"ـــــ کبیر نے داستان ختم کرتے ہوئے مزید کہا ـــــ" یہاں تک کہ جب اس نے چیزوں کے دام بیالیس فی صد بڑھا دئے تو بھی کسی نے کچھ نہ کہا۔ میں نے رتن سے ایک دن اس سلسلہ میں بات کی تو اس نے جواب دیا۔ امریکہ سے کہو، سونے کا بھاؤ کم کرے۔ عربوں سے کہو، تیل کا دام نہ بڑھائیں"

سب نے یہ بات سنی تو گہری سوچ میں ڈوب گئے ـــــ پھر اچانک فرید بولا،

" بات دراصل یہ ہے کہ رتن نے مصنوعی دانت لگوا لیے ہیں"

" مصنوعی دانت تو رتن کے اور بھی ساتھیوں نے لگوا لیے ہیں۔ کئی مر گئے ہیں، کچھ کو لقوہ مار گیا ہے اور کچھ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے" فقیر نے اطلاعاً کہا۔

" اب کے نمائش میں شاید مجھے بھی سانپ کاٹ لے" وزیر نے گہری سانس لیتے کہا۔

" ٹھیک ہے سالے۔ زندگی مزے سے کٹے گی پھر تمہاری" فرید بولا " آدمی ساری زندگی سانپ کے کاٹنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ پھر ایک لمحہ آتا ہے اور اس کی امید بر آتی ہے۔ اور ہر چیز پر سونا چڑھ جاتا ہے سب سنہرا ہو جاتا ہے"

" ویسے بھی وزیر نے سونے پر سہاگہ کر لیا ہے" فقیر بولا۔

"وہ کیسے؟" فرید نے پوچھا۔

"اس نے اِس بار سب نیوڈ پینٹ کئے ہیں۔ ننگی آنکھوں پر جھکی ہوئی، بڑی، بڑی پلکیں۔ شہوت کے رنگ میں رنگے ہونٹ۔ پکے پھلوں کی طرح رس ٹپکاتی چھاتیاں، ہلکے بھورے بالوں میں چھپی ہوئی شرم گاہیں اور سنگِ مرمر کے ستونوں جیسی چکنی سڈول رانیں،" فقیر نے بتایا۔

"اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ زندگی تو سات بٹہ اُنیس ہو کر رہ گئی ہے۔" فرید مایوسی سے بولا اور چائے کی آخری چُسکی لے کر خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

رتن کیفے کی مالکن سے اپنی گفتگو ختم کر کے لوٹ رہا تھا۔ وہ اُن کی میز کے قریب رُکا اور کبیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا "کل سے مالکن چیزوں کی قیمتیں اکتیس فی صد کم کر رہی ہے!" اور پھر کبیر کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔ کبیر نے جواب دینے کے بجائے پہلے اس کے چہرے پر دیکھا پھر باقی لوگوں کے چہروں پر کسی کے چہرے نے اسے کچھ نہ کہا تو اس نے ایک گہری سانس لے کر سر جھکا دیا۔ رتن یکدم سنجیدہ ہو کر تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا اور پھر بیٹھ کر جیب میں سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور نوٹ گن کر بنڈل پھر جیب میں رکھ لیا۔

وہ جو باہر سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا ہے اور جس کی کوئی پہچان نہیں اور جو بے نام ہے، سارا ایندھن ختم کر چکا تھا اور اب چائے کے کپ میں چمچہ چلا کر شکر گھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ سب بالکل نہیں آ رہا تھا کہ ایک ایک پل میں یہاں کتنے انقلاب برپا ہو چکے ہیں۔

"ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ اور دوسری طرف وہ اور وہاں سے ہمارے دوست کا کٹا ہوا سر ہمیں موصول ہو چکا ہے۔" ریڈیو پر کمنٹری چل رہی تھی

تین خوبصورت لڑکیاں مردانہ لباسوں میں وارد ہوئیں۔ کسی نے ان کی طرف توجہ

نہ دی۔ انھوں نے مسکرا کر مالکن کو وش کیا۔ مالکن نے بھی اتنی ہی خندہ پیشانی سے ان کے ساتھ جوابی کاروائی کی۔ اور بے نام پھر بھی کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے سے بالکل لاعلم رہا۔

" تم اپنے نیوڈز کو یہ لباس کیوں نہیں پہنا دیتے وزیر؟" فرید نے ان لڑکیوں کی طرف کنکھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "سیکس تو اس لباس میں بھی چوکھا مل جائے گا۔"

" مگر یہ لڑکیاں ننگی رہ جائیں گی اور پھر کہیں بھی جا نہ پائیں گی۔" وزیر نے جواب دیا۔

" ہاں! بات ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے انھیں اپنی شرم گاہیں ڈھانپنے کے لیے ایک ایک کُتّا پال لینا چاہیئے تھا۔ چھوٹا سا بڑے بڑے سفید بالوں والا۔" بے نام بولا جس کا چہرہ ایندھن کی وجہ سے قدرے چمک اُٹھا تھا۔

سب ہنسنے لگے۔ وہ پھر بولا "گاؤں سے چٹھی آئی ہے ایک آدمی نے کمبل ڈال کر شیر کو مار دیا ہے۔ اسے سرکار نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا ہے۔"

فرید نے قہقہہ لگایا اور پوچھنے لگا ——— "اس شرح سے چوہا مارنے کے پانچ روپے ہی بنیں گے نا؟"

" میرے باپ کو سرکار نے ایک سو ساٹھ روپے مہینے پر آدمی مارنے کے لیے رکھا ہوا تھا ——— وہ فوج میں تھا۔ اور اسے راشن اور وردی مفت ملتی تھی ———" بے نام نے ایک اور اطّلاع دی۔

مالکن اپنے کونٹر پر سے چیخی۔

" یہ فوج کا نام کس نے لیا۔؟"

"میں نے جی!" بے نام نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بلند آواز میں جواب دیا ——— "میرا باپ فوج میں تھا۔"

" ٹھیک ہے ——— سمجھی۔" مالکن نے اپنی خوبصورت آنکھوں پر پلکوں کے غلاف چڑھائے اور بِل کاٹنے میں مشغول ہو گئی۔

"آج تو بیالیس فی صد بڑھے ہوئے داموں ہی سے بل کیٹس گے۔ کل اکتیس فی صد کم داموں پر۔ کیوں یہی بات ہے نا؟" فقیر نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن کیا فرق پڑتا ہے؟ ــــــ زندگی تو سات بٹہ اُنیس ہو کر رہ گئی ہے۔" فرید پھر بڑبڑایا۔

"کیوں بے نام! زندگی کے سات بٹہ اُنیس ہونے سے تمہیں کچھ فرق پڑا؟" فقیر نے بے نام کی طرف اپنا رُخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ نہیں!" بے نام نے جواب دیا۔ "کہ میں اِس حوالے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا ــــــ میری سیڑھیاں نہ گرمیوں میں تپتی ہیں اور نہ سردیوں میں یخ ہوتی ہیں۔"

"ارے یار اس سے بات کرنا فضول ہے۔ یہ کوئی انٹیلکچول تھوڑی ہے۔ اسے تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایندھن چاہیئے اور سیڑھیوں پر کا سائبان جو اسے گرمیوں کی گرمی اور سردیوں کی سردی سے بچائے رکھے۔" وزیر نے کہا۔ "یہ ہماری پرابلم ہے۔ جو زنگوں کے معنی جانتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے اس بار نیوڈز بینیٹ کیے ہیں۔ یہ کیسے سمجھے گا اس بات کا مطلب؟"

پیچھے والی میز سے کچھ پھسپھساہٹ سی سنائی دی۔ پھر دبا دبا سا قہقہہ اور پھر کسی نے قدرے بلند آواز سے کہا ــــــ "سنا تم نے؟ وہ آدم نے کویتا سے شادی کر لی!"

"کویتا؟ کون وہ زمانے کی چچوڑی ہوئی ہڈی؟" ــــــ دوسری آواز سنائی دی

"ہاں وہی!" پہلی آواز۔

"اُف توبہ۔ گر گیا بیچارہ گڑھے میں۔" تیسری آواز "جب وہ پان چباتے ہوئے شام کو ٹہلنے نکلتی ہے تو لگتا ہے۔ کوئی ویشیا کساد بازاری سے گھبرا کر بس اسٹاپ پر گاہک ڈھونڈنے آگئی ہے ــــــ آخر آدم کا پرابلم کیا تھا؟"

پہلی آواز پھر اُبھری "وہ اس کی کتابوں کے ٹائیٹل بنانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ جو ناول لکھ رہی ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور اس بہانے اس کا بنایا ہوا

ٹائیٹل بھی۔ ہا، ہا، ہا۔"

"ہا، ہا، ہا۔ کیسے کیسے سپنے دیکھتا ہے آدم بھی!" دوسری آواز۔

"میں نے کل رات ایک سپنا دیکھا تھا۔" بے نام نے بلند آواز سے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہا۔

"کیسا سپنا؟" فرید نے پوچھا۔

"میں نے دیکھا۔ میرا ایک گھر ہے بڑا ہی دلکش سجا سجایا۔ باہر آنگن میں ایک گل موہر کا پیڑ ہے۔ جس پر پھولوں کی لڑیاں اس طرح لٹک رہی ہیں گویا آگ سے نکلتی ہوئی لپٹیں ہوں۔ ـــــ جب رات کو ہم اپنے گھر کے چراغ روشن کرتے ہیں تو اُن کے پرتو سے پھولوں کے ریشے چمک اٹھتے ہیں اور اُن کی روشنی میں چڑیاں اپنا رات کا کھانا تیار کرتی ہیں۔ اور بچوں کو کھلا کر خود کھا کر سو جاتی ہیں۔ نیچے زمین میں ایک گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع رہتا ہے۔ چڑیاں اپنے بچوں کو صبح اُس پانی سے نہلا کر تیار کرتی ہیں۔ پھر سامنے جنگل سے ایک بھیڑ اور ایک شیر خراماں خراماں اس گڑھے تک پہنچتے ہیں۔ ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں اور اپنا چہرہ پانی کے عکس میں دیکھ کر شیک ہینڈز کرتے ہیں اور مسکراتے ہوئے پھر جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں۔ بڑا دلکش منظر ہوتا ہے۔ کہ اچانک ایک چیل ایک چڑیا پر جھپٹی ہے . . ." بے نام بولا چلا جا رہا تھا کہ وزیر نے ٹوک دیا۔

"کیا ایبسرڈ سپنا ہے۔"

"ٹک۔ ٹک۔ ٹک یہ سپنا کون دیکھ رہا ہے؟" سب نے کونٹر کی طرف دیکھنا شروع کیا ـــــ وہاں مالکن ہاتھ میں ایک ٹیبل سپون لیے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ غضب ناک تھا۔

"میں نے جی!" بے نام اپنی سیٹ سے کھڑا ہو کر بولا۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا رکھا تھا۔ جیسے بچے کلاس روم میں اپنی ٹیچر کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

مالکن نے ٹیبل سپون کاونٹر کے ٹاپ پر رکھا اور دایاں ہاتھ کمر پر رکھ کر پوچھا ـــــ "کیا اس سے پہلے بھی تم نے کبھی سپنا دیکھا تھا۔ یاد رکھو یہ ریستوران ہے۔

بیڈ روم نہیں۔"

" جی میں نے تو نہیں میرے باپ نے ضرور دیکھا تھا۔ آئی ایم سوری!" بے نام نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

" پھر کیا ہوا؟" مالکن نے گہری فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

" جی بس جیسے ہی وہ اپنی خندق میں سے نکلا دشمن کی گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔" بے نام نے گہرے غم میں ڈوب کر کہا اور اپنی گردن جھکالی۔

" اوہ! ٹھیک ہے۔" مالکن نے کہا اور پھر مطمئن ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور حسب معمول بل کاٹنے لگی۔

بے نام بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا پڑ گیا ہے۔ اس کے تمام ساتھی دوران گفتگو ایک ایک کر کے جا چکے تھے ـــــ وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھا ایک طائرانہ نظر سارے ہال پر ڈالی مالکن اور گاہک سب اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے ـــــ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آرٹ گیلری سے باہر نکلا اور پھر سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گیا۔ اسے لگا رات دھیرے دھیرے سب طرف اپنے سیاہ پر پھیلا رہی ہے

وزیر کی نمائش ملتوی ہو گئی ہے۔ یہ اسے فرید نے آکر بتایا تھا۔ کہ وہ کچھ نئی تصویریں بنا رہا ہے اس روز فرید اُس کے قریب ہی سیڑھیوں پر آبیٹھا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ اُسے اس کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر پتہ چلا کہ یہاں زندگی کتنی مختلف ہے۔

" لیکن سیڑھیوں پر بیٹھ کر زندگی کا اصلی مزہ اس وقت آتا ہے۔ جب بے مکانی کا عالم ہو ـــــ بے سروسامانی کا احساس ہو اور ذہن میں خلا کا گہرا گڑھا ـــــ" بے نام نے مسکرا کر اسے بتایا۔

فرید اٹھا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ بے نام حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ اندر نہیں جا سکتا تھا کہ مالکن نے "رائٹیس

آف ایڈمیشن" کے تحت اس کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ کہ مبادا اُس کی خواب دیکھنے کی عادت دوسرے گاہکوں کی بینائی پر اثر انداز ہو۔ ویسے اب مالکن کی طرف سے ہی اسے وقت پر ناشتہ اور چائے بھجوادی جاتی تھی۔ وہ خوش تھا۔ اور خاموش تھا۔

وہ وزیر کی نمائش کا افتتاحی دن تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی ــــــ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ ریشمی لباس سرسرا رہے تھے اور سارے میں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اوپر ٹیرس پر کاک ٹیل ٹیبل لگی تھی۔ بڑے ہال میں تصویریں آویزاں تھیں۔ اور چھوٹے ہال میں لوگ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ پس منظر میں شہنائی کی مدّھم لَے گونج رہی تھی۔

بے نام نے اندر جا کر ایک بار سب طرف نظر دوڑائی۔ اور سارے منظر سے لُطف اندوز ہوا۔ لیکن جب اس نے دیواروں پر ہینگ کرتی ہوئی وزیر کی پینٹنگز دیکھیں تو دھک سے رہ گیا۔

وہاں کوئی بھی تصویر ایسی نہ تھی جس کا سبجیکٹ انسان ہو ــــــ ننگا نہ ڈھنپا ہوا۔ کچھ جانوروں کی تصویریں تھیں۔ اور کچھ تصویریں ان لباسوں کی تھیں جو اُس دن اُن تین لڑکیوں نے پہن رکھے تھے ــــــ اور ہر لباس کے ساتھ ایک ایک لمبے سفید بالوں والا ننھا سا کتّا تھا۔

ایک تصویر پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس کی نقاب کشائی چیف گیسٹ کو کرنا تھی کہ وہ ابھی آیا نہ تھا۔ سب لوگ اس تصویر کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے اور چیف گیسٹ کا انتظار تھا۔

آخر خدا خدا کر کے چیف گیسٹ وارد ہوا۔ اُس تصویر کے رُخ لگی ہوئی بڑی سی لائٹ آن کر دی گئی۔ چیف گیسٹ نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر تصویر پر پڑا ہوا کپڑا کھینچ دیا ــــــ سب نے زوردار تالیاں بجائیں۔

وہ بے نام ہی کی تصویر تھی۔ پورے قد کی وہ اُس میں دونوں بازو پھیلائے

ہوئے ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ تصویر میں جسم کی تمام رگیں گل مہر کی طرح چمک رہی تھیں۔

بے نام کی حالت بڑی عجیب تھی۔ اس کا سارا جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا تھا۔ اُسے بڑی شرم آ رہی تھی کہ اگر لوگوں نے اُسے پہچان لیا کہ یہ اس کی تصویر ہے تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے یوں ننگ دھڑنگ.... مگر بڑی عجیب بات ہے۔ وہ اس بھیڑ میں کھڑا تھا۔ اس کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی نہیں پہچان رہا تھا۔ سب اس کی پورے قد کی تصویر دیکھ رہے تھے۔ اور وزیر کے فن کی تعریف کر رہے تھے۔
بے نام کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ جب اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تو وہ مایوسی سے سر جھکا کر بھیڑ سے باہر نکل گیا اور آرٹ گیلری کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

دوسرے دن صبح جب جمعدار گیلری کی صفائی کرنے کے لیے آیا تو اس نے دوسرے کچرے کے ساتھ سیڑھیوں پر ایک لاش بھی پڑی دیکھی۔ اس نے سیکورٹی والوں کو بلایا۔ پھر ایمبولینس آئی اور لاش اٹھا کر لے گئی ـــــ یہ بھی پتہ چلا کہ اس کے سینہ پر ایک گہرا گھاؤ ہے اور مردہ آدمی کا دایاں ہاتھ خون سے لت پت ہے۔

شام جب آرٹ گیلری کے بڑے ہال کا دروازہ کھُلا تو ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ پورے قد کی تصویر جس کی نقاب کشائی چیف گیسٹ نے کی تھی اس کا کینوس بالکل خالی پڑا ہے اُس میں پینٹ کیا ہوا پورے قد کا ننگا آدمی غائب تھا اور جگہ جگہ خون میں ڈوبی ہوئی انگلیوں کے نشان تھے۔

رُک جاؤ

ساری کائنات بس اتنی ہی ہے جتنی مجھے دروازے کے فریم میں سے نظر آرہی ہے
اور اس کائنات کے تمام عناصر راکھ کے ذرّوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں جنھیں میری
خوردبین نظروں نے دیکھ لیا ہے۔ ان ذرّوں میں ہر عضو کا دل دھڑک رہا ہے
اور کبھی کبھی وہ دھڑکن شور بن جاتی ہے ـــــ اگر کائنات بس اتنی ہی ہے تو پھر یہ سارا
جھگڑا کس بات کا ہے۔ اسے بل بانٹ کے کیا کھا سکیں گے ـــــ؟

لیکن یہ کائنات اتنی تو نہ تھی ـــــ یہ سب کچھ تو کل رات ہوا ہے۔ کل رات سے
پہلے ہر چیز طویل تھی، ہر چیز عریض تھی ـــــ اور چلتے چلتے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے۔
پنڈلیاں اینٹھ گئی تھیں، اور میں تھک ہار گیا تھا ـــــ اور مجھے کھڑا رہنے کیلئے سہارے
کی ضرورت تھی، اور میں نے دیوار کا سہارا لیا تھا اور کال بیل CALL BELL کے بٹن
پر ہاتھ رکھ دیا تھا ـــــ دُور کہیں گھنٹی بجی تھی اور پھر ایک تھکی سی آواز سنائی دی تھی

"کون ـــــ؟"

ایک پل کے لیے میں نے سوچا تھا میں کون ہوں۔؟ میں کیا جواب دوں ـــــ؟
کیا میری آواز میں ابھی تک وہ لوچ باقی ہے کہ میری آواز میری پہچان ثابت ہو۔؟

"میں ہوں!"

میں نے جواب دیا تھا اور دروازے کے قریب آکر قدموں کی چاپ رک گئی تھی
ـــــ اور پھر دروازہ چرچرا کر کھلا تھا جیسے کسی قدیم قلعے کا دروازہ کھلا ہو اور میرے
سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی جس کے سامنے کے بال سفید ہو چکے تھے ـــــ
چہرے کی شادابی ماند پڑ چکی تھی آنکھیں دھندلا گئی تھیں، کمر ذرا سی آگے کو جھک گئی

تھی اور جھکی ہوئی کمر کے نیچے کا حصہ پھیل گیا تھا۔

میں نے اس چہرے میں ان خدوخال کو ٹٹولنے کی کوشش کی جو وقت کی طوالت کی وجہ سے اس چہرے میں گم ہو چکے تھے اور وہی پرانی دلآویز مسکراہٹ دھیرے دھیرے رینگ کر اکٹھا ہونے لگی تھی —— جسے میں نے بیس یا پچیس برس پہلے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی —— میں نے اسے پہچان لیا تھا —— اور اس نے مجھے —— اور پھر دو بانہیں میری طرف لپکیں

آنسوؤں سے دھل کر چہرہ نکھر گیا —— اور ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے سوال پر سوال کئے جا رہے تھے۔ کوئی کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا —— بس سوال ہی سوال —— بات بھی ٹھیک تھی —— ان بیس پچیس برسوں میں زندگی نے ہمیں سوالات سے لاد دیا تھا —— ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"کیسے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"اچھا ہوں" میں نے جواب دیا تھا۔

"اتنا عرصہ کہاں رہے؟"

"بھٹکتا رہا"

"کٹ!!" ڈائرکٹر کی آواز سیٹ پر گونجی ——

—— کیمرہ رک گیا، لائٹس آف ہو گئیں پنکھا چلنے لگا اور اس کی آواز ساری اسٹیج پر منڈلانے لگی۔

"ویری پرفیکٹ شاٹ" ڈائرکٹر نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ہالی ووڈ" چیف اسسٹنٹ نے مسکراتے ہوئے فائل بند کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"بھئی برا نہ مانیے گا، لگتا تھا جیسے آپ سچ سچ پریمی ہوں" پروڈیوسر اپنے گلے میں لٹکتی ہوئی سونے کی زنجیر کو گلے میں گھماتے ہوئے بولا۔

ہم پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تھا —— اس کا شوہر ابھی دفتر سے لوٹا نہیں تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر نہیں آتا تھا —— یار دوستوں کے ساتھ گپ بازی کرتا تھا۔

کبھی کبھی پینے پلانے کا پروگرام بھی بن جاتا تھا تو اور بھی دیر سے آتا تھا۔ وہ عنقریب ہی ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس وجہ سے اس کی مصروفیات اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ یعنی ملنے ملانے والوں سے مل کر مستقبل کے پلان بنانا تھے "کوئی نوکری مل جائے گی تو اچھا ہوگا" وہ کہتا تھا۔

"کوئی بزنس کیوں نہیں کر لیتے" اس کا دوست یا ملنے والا سوال کرتا ——

"کیا بزنس کروں گا —— ساری زندگی تو سرکار کی خدمت میں گزر گئی بزنس کے لیے تجربہ کہاں ہے" وہ جواب دیتا۔

"ٹھیک ہے میں راج ہنس سے بات کرتا ہوں —— انڈسٹریلسٹ ہے، اچھا خاصہ جما رکھا ہے اس نے۔ کارخانے میں کئی طرح کے کام ہوتے ہیں۔ پھر پڑھے لکھے آدمی کی تو سب جگہ ضرورت رہتی ہے" اس کا دوست تسلّی دیتا —— اور وہ شراب کے نشے میں ساری باتیں اسے بتاتا اور پھر اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو کر پڑ کر سو رہتا۔

سوتے میں وہ خرّاٹے مار رہا تھا —— اور وہ قریب بیٹھی سویٹر بنتی ہوئی اس کے خرّاٹوں کی آواز سن رہی تھی —— سویٹر وہ کس کے لیئے بن رہی تھی —— اسے بالکل معلوم نہ تھا۔ کیونکہ سویٹر تو اس کے شوہر کے پاس اور خود اس کے پاس ڈھیر سارے تھے اور کوئی بچہّ تو ہوا ہی نہ تھا۔

وہ سویٹر پہنے بیٹھی تھی۔ اُس نے اب غور کیا تھا۔

"یہ سُویٹر میں نے اپنے لیے ان دنوں بُنا تھا جب وہ بیمار تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اسے ایک فیکٹری میں سوپروائزر کی جاب JOB مل گئی تھی —— سارا دن دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ سکوٹر پر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرنا پڑتا تھا —— اور پھر اب وہ عمر تو نہ رہ گئی تھی یہ سب جھیلنے کی —— وہ بیمار پڑ گیا۔ ایک مہینہ گیارہ دن بیمار رہا اور میں بیٹھی سُویٹر بُنتی رہی"

وہی سویٹر پہنے وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر وہ نوکری چھوڑ کر کسی دوسری نوکری کے چکّر لگانے لگا اور پھر تیسری نوکری اور پھر اس پر فالج کا حملہ ہوا۔

" کہاں ہے"! میں نے پوچھا۔

" اندر سو رہا ہے" اس نے جواب دیا۔

میرے اور اس کے اندر کچھ سویا ہوا تھا ـــــ جسے بیدار کرنے کی ضرورت تھی میں چھوٹا موٹا کیرکٹر آرٹسٹ تھا۔ وہ ہیروئن تھی ـــــ مسئلہ تھی ـــــ لیکن ہماری ایسوسی ایشن بہت پرانی تھی۔ اس زمانے سے جب ایک ادھیڑ عمر عورت اس کے STILLS لئے پروڈیوسروں کے دفتروں کے چکر لگایا کرتی تھی۔ وہ عورت اپنے آپ کو اس کی ماں بتاتی تھی۔

" نہیں وہ میری ماں نہیں ہے۔ وہ میری کوئی نہیں ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔ دراصل میری ماں کون ہے میں بالکل نہیں جانتی ـــــ میں نے اپنا باپ دیکھا ہی نہیں ـــــ" اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر کہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگی تھیں اور اس نے پھُس پھُسا کر کہا تھا۔

" میں جب تمہارے کندھے پر سر رکھ دیتی ہوں تو لگتا ہے تم ہی میرے باپ ہو ـــــ مجھے بڑا سکھ ملتا ہے"۔

کانا پھوسیاں تو ہونے ہی لگی تھیں۔ سٹوڈیوز میں فلمی دفتروں میں ـــــ اخبار نویسوں کی ملاقاتوں میں۔ لیکن یہ ہمارا ذاتی معاملہ تھا ـــــ لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ ....

" ہاں ہاں ـــــ وہ رول تمہیں دیا جا سکتا تھا میں کب نہیں بول رہا ہوں۔ لیکن میاں تم اپنی اوقات بھول جاتے ہو" وہ ایک ہیروئن ہے اور تم۔ خیر جانے دو ـــــ یار سچی بات تو یہ ہے کہ لوگوں کو یہ سب اچھا نہیں لگتا" اس کے ایک ڈائرکٹر دوست نے کہا تھا" اور دوسری سچی بات یہ ہے کہ تم اس کے کیریئر کی بھی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دو گے"

" اچھا یہ بتاؤ ـــــ تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ تم نے لائن ہی چھوڑ دی" وہ پوچھنے لگی۔

" دراصل ..... دراصل" میں جواب دینے کے لئے اپنی ساری طاقت اکٹھی کرنے لگا اور پھر بمشکل کہا" دراصل ایک جسم اور دو ذہن ـــــ دوسرے جسم اور ذہن میں میلوں کا فاصلہ ہے دو ذہنوں اور جسموں کے درمیان ایک رشتے کو دوسرے ذہن اور

جسم محسوس نہیں کر سکتے۔ میں تمہارا کیریئر برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں وہاں سے چل دیا اور پھر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ لیکن یقین مانو میں کہیں بھی رہا —— تم میرے اندر رسانسیں لیتی رہیں۔"

"لیکن پھر بھی کیا کرتے رہے ؟"

"بچوں کو سرگم سکھاتا رہا —— سارے گا ما پا دھا نی سا ......"

اندر کے کمرے سے کسی کے نرخرے کے خرخرانے کی آواز آئی —— وہ اٹھی اور بولی "شاید اسے کسی چیز کی ضرورت ہے —— وہ مجھے بلا رہا ہے ——" اور پھر اندر چلی گئی۔

اور پھر اندر سے اس کی آواز آئی۔

" وہ ایک دوست ہے، بہت پرانا دوست۔ کبھی ہم اکٹھے کام کرتے تھے۔ ہاں جب میں فلموں میں کام کرتی تھی۔ پھر وہ لائن چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا —— شاید اس نے بچوں کو سنگیت سکھانا شروع کر دیا تھا۔ آج ملنے آیا ہے۔ کہیں سے میرا پتہ مل گیا ہوگا —— اسے مل کر بڑا عجیب لگ رہا ہے۔ پچھلا وقت لوٹ آیا ہے۔ ویسے ہی جیسے تمہیں مل کر لگا تھا —— تم میرے بچپن کے دوست تھے —— میں فلم لائن سے اُوب چکی تھی اور تم اچانک مل گئے تھے —— اور تم نے کہا تھا کہ تم مجھے شروع سے ہی چاہتے رہے ہو —— اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو —— میری زندگی خالی خالی سی ہو چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ بھی ڈھنگ کا نہیں لگ رہا تھا —— تمہارے پاس سرکاری نوکری تھی۔ میں آزاد تھی۔ میں نے اپنے پر کاٹ ڈالے اور تمہارے پنجرے میں داخل ہو گئی —— وہ پنجرے کے باہر بیٹھا میری طرف بڑ بڑ دیکھ رہا ہے۔ مجھے پھر بڑا عجیب لگ رہا ہے —— کیا کہا، چائے چاہیے —— ؟ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں مجھے بڑا عجیب لگ رہا ہے۔ آج ایک ہی برتن میں مجھے تم دونوں کے لئے چائے بنانا ہوگی ——"

وہ کچن میں چائے بنانے چلی گئی —— وہاں برتنوں کی آواز آنے لگی اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی —— اور میں نے آنکھیں بند کر لیں —— بند آنکھوں میں پچیس برس پہلے کا منظر ابھرا —— جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک ویران

سڑک پر چلے جا رہے تھے ——— تھوڑی دُور پر ریس کورس کا میدان تھا اور وہاں گھوڑوں کو تربیت دی جا رہی تھی۔ ان کے بھاگنے سے ان کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ ایک دھمک سی ابھرتی تھی۔

ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک ٹی اسٹال تک پہنچ گئے اور وہاں ہم نے ایک ہی کپ میں چائے پی تھی۔ بڑا مزا آیا تھا۔

"لو چائے پیو ——" اس نے دراصل مجھے چائے کے لئے ہی بلایا تھا۔" اس نے چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر اندر چلی گئی ——— "آؤ تمہیں چائے پلاؤں" اندر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر شاید وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چائے پلانے لگی۔ میں چپ چاپ بیٹھا اپنے سامنے پڑے چائے کے پیالے کو گھورتا رہا۔

"تم نے ابھی چائے نہیں پی:" اس نے آکر پوچھا۔

"نہیں میں تمہارا انتظار کر رہا تھا"

"میں نے تو ابھی پی تھی ——"

"اور میں سمجھا شاید ......"

"کیا مطلب ؟"

"تمہیں یاد ہے۔ کسی زمانے میں ہم ایک ہی پیالے میں چائے پیا کرتے تھے۔ میں نے سمجھا شاید آج بھی تم ...."

اس نے چائے کا پیالہ اٹھایا آہستہ سے اسے ہونٹوں سے لگایا اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو چائے کے پیالے میں ٹپک گئے پھر اس نے وہ پیالہ میری طرف بڑھایا۔

میں اس پیالے کو ہاتھوں میں لے کر دھیرے دھیرے چائے کی چسکیاں لینے لگا اور وقت آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ وقت کے اس رینگنے کے عمل نے ہم دونوں سے ہی ایک دوسرے کو دُور بہت دُور کر دیا تھا۔ میں چاہتا تھا وقت رک جائے۔

لیکن میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ میں نے پیالہ میز پر رکھ دیا اور اس کی

طرف دیکھنے لگا غور سے بڑ بڑ۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ہنسی وہی ٹھنکتی ہوئی ہنسی ــــــ جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

"میں تو یہاں ہوں تمہارے سامنے، پھر کہاں تلاش کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہی تو بات سمجھ میں نہیں آ رہی ــــــ آج میں پنجرے کے باہر ہوں تم پنجرے کے اندر ہو لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں کہ اچانک مجھے احساس ہوا تھا کہ میں تمہیں نہیں جانتا ــــــ تمہاری کھال کے نیچے ایک اور کھال ہے اور اس کے نیچے ایک اور کھال۔ اور دور اندر تم چھپی بیٹھی ہو ــــــ تم ماں ہو یا محبوبہ ہو ــــــ؟ یہ میں جاننا چاہتا تھا۔ کہ ہمیں ایک دوسرے کے کیریئر کا واسطہ دے کر الگ کر دیا گیا ــــــ اور پھر تمہارے کہنے کے مطابق تم نے اپنے پر کاٹ کر پنجرے میں پرورش کر لیا اور وقت رینگنے لگا اور ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے گئے ــــــ اور پھر اس دُوری کی تہوں میں تمہیں کھوجتا رہا اور تلاش کرتا رہا ــــــ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ بیٹھے ایک دوسرے کے قریب کہ ایک ہی چائے کے پیالے سے دونوں ہونٹ لگا کر چائے پی سکیں اور ہم نے چائے پی۔ اور پھر میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور مجھ پر عیاں (پر گٹ) ہوا کہ مجھے اب بھی تمہاری تلاش ہے ــــــ تمہارے بڑھاپے کی کھال کے نیچے جوان کھال میں لیٹی ہوئی ایک عورت کو میں چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں اسے محسوس کرنا چاہتا ہوں اسے پانا چاہتا ہوں تاکہ میری تلاش ختم ہو کیونکہ تمہارے وجود میں میرا وجود چھپا ہوا ہے ــــــ اور میں اپنے وجود تک پہنچنا چاہتا ہوں......"

اندر سے کسی کے نرخرے کے خرخرانے کی آواز آئی، وہ اٹھی اور اس نے جانے سے پہلے مجھ سے کہا۔

"تم میرے شوہر ہو... لیکن میں پنجرے میں بند ہوں۔ ایک ایسے آدمی کے

پنجرے میں جو فالج زدہ ہے' اپاہج ہے۔ وہ بھی میرا شوہر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اپاہج ہے۔ اپاہج تم بھی ہو۔ نہ وہ مجھے چھو سکتا ہے نہ تم۔ اور مجھے ایک ہی برتن میں دونوں کے لیئے چائے بنانا ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے چائے پلانا ہے اور تمہارے پیالے میں ٹھیک اسی جگہ اپنے ہونٹ جما کر گھونٹ بھرنا ہے جہاں تم نے ہونٹ رکھے ہوں۔ میں جارہی ہوں ـــــ وہ مجھے بلا رہا ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔ تم وہ ہو یا وہ تم ہے اس کا فیصلہ میں تو نہیں کر سکتی ـــــ!"

" تو ٹھیک ہے ـــــ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے مل کر ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہوں" میں کہتے ہوئے اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔

" رک جاؤ ـــــ" وہ گویا چیخی " تم اندر نہیں جا سکتے۔ تم اس سے مل نہیں سکتے یہ ایک عورت کی حدود ہیں ـــــ جنھیں پار کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ـــــ اسی بات پر عورت زندہ ہے۔ ورنہ اب تک کبھی کی خاک کے ذرّوں کی طرح فضا میں بکھر کر اُڑنے لگتی۔

میں وہاں کھڑے کا کھڑا رہ گیا ـــــ مجھے لگا گویا ساری کائنات دھیرے دھیرے سکڑنے لگی ہے اور کائنات کے سارے عناصر خاک کے ذرّوں کی طرح فضا میں بکھرنے لگے ہیں ہاں ایک فرق ضرور ہے۔ کل رات بالکل خاموش تھی لیکن اس وقت ہر عنصر کا دل دھڑک رہا ہے۔

ایلوپیشیا

اس شام مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ ساحل کی طرف نکل گیا۔ پاؤں کے نیچے نرم بھُر بھُری ریت۔ گدراتا آسمان دُور دُور تک پھیلا ہوا۔ اور سامنے گہری سانسیں لیتا ہوا سمندر ــــــ میں کافی دیر تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ تھک گیا۔ اور ایک جگہ بیٹھ گیا ــــــ وہاں بالکل تنہائی تھی۔ کوئی آس پاس نہ تھا۔ چرند نہ پرند نہ کوئی پیڑ پودا۔ نہ جانے میرا جی رونے کو کیوں چاہ رہا تھا۔ اکثر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے۔ تب میں رونے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنے لگتا ہوں کبھی ماں بے انتہا یاد آتی ہے یا پھر بابوجی یاد آتے ہیں، اُن کی مہربان آنکھیں یاد آتی ہیں۔ مسکراتے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ یاد آتے ہیں۔ اور میں بھبھک بھبھک کر رونے لگتا ہوں ــــــ وہ رونا اکثر بے وجہ ہوتا ہے۔

مگر اس شام . . . ؟ ــــ اس شام عجیب بات ہوئی۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی غنچہ آپ ہی آپ کھل اٹھا۔ اور اس کی خوشبو میرے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ وہ دراصل آگہی کا احساس تھا۔ مجھے سب معلوم ہو گیا تھا۔ میں سب جان گیا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔؟ کیوں ہو رہا ہے۔؟ اور کون کر رہا ہے ؟ میں نے اچانک اسے پہچان لیا تھا اور جب آپ کسی چھپی ہوئی ہستی کو، جو آپ کے گرد بہت کچھ ہونے کا باعث ہوتی ہے پہچان لیتے ہیں تو کرب بڑھ جاتا ہے۔ بے بسی آپ کو مغلوب کر لیتی ہے۔ ایسی ہی حالت میں ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ اس شام رونا بے وجہ نہ تھا۔ نہ مجھے بابوجی یاد آ رہے تھے۔ اور نہ ہی ماں کی مہربان آنکھیں اور مسکراتے ہوئے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے پتلے پتلے ہونٹ ــــــ ماں بڑی خوبصورت تھی۔ بابوجی بھی کیا کم تھے؛ ویسے تو ساری

کائنات ہی انتہائی خوبصورت تھی۔ اور میں اس وادی میں جنگلی گھوڑے کی طرح بھاگتا پھرتا تھا۔ ہاں! مگر یہ کب کی بات ہے؟۔ جب آس پاس کوئی نہ تھا۔ چرند نہ پرند نہ کوئی پیڑ پودا۔
میں بھبھک بھبھک کر رونے لگا، نہ جانے کب تک روتا رہا ـــــ کہ اچانک میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، سمندر کے آنگن میں سورج کا قتل ہو گیا تھا۔ میں نے سمندر کی سطح پر دھیرے دھیرے پھیلتے لہو کو دیکھا حتیٰ کہ میری نظریں خون سے لت پت ہو گئیں ـــــ مجھے لگا جیسے کائنات کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا ہے اور خلا میں لرزنے لگا ہے۔
میں شرمندگی کے احساس سے بھر گیا۔ مجھے اپنا رونا دھونا بکواس لگا۔ گو کہ میں کائنات ہی کا ایک حصّہ ہوں۔ اجتماعی غم اور انفرادی غم کی بحث چھڑ سکتی ہے ـــــ مگر میں اس شام کسی قسم کی بحث کے مُوڈ میں نہ تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا ـــــ اور واپس لوٹنے کے لئے قدم اٹھائے پلٹ کر دیکھا ـــــ سمندر کے آنگن میں پھیلا ہوا سورج کا سرخ خون کالا پڑ گیا تھا۔ اور سمندر دھیرے دھیرے بین کرنے لگا تھا ـــــ
میں خوش اور ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ میں نے وہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا آخر سورج قتل کر دیا گیا۔ اور میں چشم دید گواہ تھا۔ میں سب جان گیا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا . . . .

جب وہ ساحل کی طرف سے آبادی کی طرف جا رہا تھا ـــــ تو سب طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ شہر میں چراغاں ہُوا اٹھا تھا۔ سڑکوں پر لوگ تیزی سے آ جا رہے تھے۔ موٹر کاریں، بسیں اور پیدل چلنے والے ایک دوسرے کی ضد میں مختلف سمتوں کو چلے جا رہے تھے وہ کسی قریبی بَس سٹاپ پر پہنچنا چاہتا تھا۔ کہ وہاں سے وہ اپنے گھر جا سکے ـــــ
ـــــ وہ بس اسٹاپ کے قریب پہنچا تو ایکا ایکی ٹھٹھک گیا۔ اسے لگا جیسے اس کی کوئی بہت ہی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ ایسی شے جو اسے بہت ہی عزیز تھی۔ جسے وہ سب کی نظروں سے چھپا کر رکھتا تھا۔ کھڑے کھڑے اس نے اپنا سارا وجود ٹٹول مارا مگر اسے یاد نہ آیا کہ وہ کیا شے کھو بیٹھا ہے؟ بڑی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب کیفیت تھی ـــــ وہ چند قدم اور بڑھا اور بس سٹاپ تک پہنچ گیا ـــــ وہاں بہت

سے لوگ کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔

خدا، خدا کر کے بس آئی ۔۔۔ مگر ... مگر یہ وہ بس نہ تھی جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی ۔۔۔ لوگ اس بس میں سوار ہونے لگے اور وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ کہ یہ وہ بس نہیں ہے جس میں اُسے سوار ہونا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے یہ کیا ہوا ۔۔؟ تو وہ کون سی بس ہے جس میں اسے سوار ہو کر گھر پہنچنا ہے؟

اب اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ نہ اسے بس کا نمبر یاد رہ گیا تھا، نہ وہ سڑک کہ جس پر سے ہو کر وہ گھر جاتا تھا ۔۔۔ اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ اسکا گھر کہاں ہے؟

خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔ اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا، اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے۔ اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی ۔۔۔ سو پہلا دن ہوا۔

اُس کی آنکھ کھُل گئی ۔۔۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ اس دھندلکے میں چھت کا پنکھا اِس طرح گھوم رہا تھا جیسے سمندر کی سطح پر کوئی ابابیل اپنے پیپید پر پھڑپھڑا رہی ہو اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سوئے ہوئے بیٹے کو ٹٹولا ۔۔۔ اور کہا۔

"اٹھو بیٹا اسکول کا وقت ہو گیا"

اپنی دَبی، دَبی سی آواز اُسے بڑی پُراسرار لگی۔ اس کا بیٹا ذرا سا کسمسایا۔ پھر اس کا جسم تن گیا۔ پھر آہستہ آہستہ ڈھیلا ہوتا ہوا بچّے کا گرم، گرم جسم اسے بڑا عجیب لگا۔ اس کا ہاتھ پھسلتا ہوا بیٹے کے چہرے تک پہنچ گیا۔ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر اُسکی آنکھیں، ناک، ہونٹ، پیشانی اور سر کے بال محسوس کیے۔ پھر بڑی ملائمیت سے اس کے سارے چہرے کو سہلانے لگا۔

ایک جھٹکے سے اس کا بیٹا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے تیر، کمان کے حلقے سے نکل گیا ہو۔

اس کا بیٹا اندھیرے میں بیٹھا آنکھیں ملنے لگا۔ اور وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بیٹے نے آہستہ سے اٹھ کر بتی جلائی۔ روشنی تاریکی سے جدا ہو گئی۔ ہر چیز صاف، صاف دکھائی دینے لگی۔ قریب ہی لیٹی ہوئی اس کی بیوی ـــــ دونوں بچیاں ـــــ کتابوں کی الماری ـــــ ڈریسنگ ٹیبل ـــــ تپائی اور بیٹھنے کے سٹول۔ سب چیزیں اپنی، اپنی جگہ بے حرکت پڑی ہوئی تھیں۔

اُس کا بیٹا کمرے سے باہر نکلا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ بیوی نے ذرا سی حرکت کی ا اور پھر خدا کا نام لے کر اٹھ بیٹھی کہ جس نے اُن سب کو ایک نیا دن دِکھایا۔

باہر سڑک پر سرکاری بسیں دندناتی ہوئی آنے جانے لگی تھیں ـــــ اس کی بیوی رسوئی گھر کی طرف بڑھ گئی جہاں اسے اسکول جانے والے بچوں کا ناشتہ تیار کرنا تھا۔ بچیاں بدستور سوئی ہوئی تھیں کہ انھیں دوپہر کی شفٹ میں اسکول جانا تھا۔

اچانک اُسے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ یہ بے چینی اُس نے اکثر محسوس کی تھی۔ اور اس بے چینی کے احساس سے وہ فکر مند ہو گیا۔ اس نے دیکھا باہر ابھی تک اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں سڑک پر اندھی سرکاری بسیں بھاگ رہی تھیں۔

بالکونی پر کھڑے ہو کر اُس نے یہ منظر بارہا دیکھا تھا۔ تیسری منزل کی بالکونی پر سے ہر چیز اپنے قد سے چھوٹی دکھائی دیتی۔ درخت، سڑک، بس اور آدمی ـــــ ایک بار اُس نے اسی بالکونی سے اپنے آپ کو دیکھا۔ اسے وہ بالکل ایک بونا سا چلتا ہوا سڑک پار کر کے اس کے گھر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ گھبرا کر بالکونی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر سے اُس نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر اُٹھایا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگایا صبح کے پہلے سگریٹ کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے اس کا جی چاہا کہ اگر اس کے ساتھ ہی ایک گرم گرم چائے کا پیالہ مل جائے . . . . . لیکن ایسا ممکن نہیں کیونکہ پہلے بچے کے لئے دودھ گرم ہو گا ـــــ کہ اسے وقت پر اسکول جانا ہے۔

اس نے رسوئی گھر میں جا کر دیکھا۔ دودھ گرم ہو چکا تھا۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو مکھن لگ چکا تھا۔ اور اب اسٹوو پر اُبلتے ہوئے پانی میں انڈا بے چینی سے حرکت کر رہا تھا ـــــ بے چینی۔؟

اس نے اپنی نظریں سیدھی بیوی کے چہرے پر گاڑ دیں اس کے چہرے کی بے چینی دیکھ کر بیوی بولی۔

" چائے۔؟ "

" ہاں کیا بچے کے لئے سب تیار ... ؟ "

" بس انڈا اتار کر چائے رکھ دیتی ہوں "

وہ مطمئن ہوگیا ـــــ چائے کی امید ہوگئی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی امیدیں ہی تو تھیں، جن کے سہارے وہ جی رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہ سب جی رہے تھے۔ وہ اپنا پیٹ کھجاتا ہوا کمرے میں آگیا۔ پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ نکالا اور بالکونی کیطرف بڑھ گیا۔

یہ بے چینی کیوں تھی ـــــ؟ اس نے سوچا۔

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ وہ ٹریولنگ کی جاب کرتا تھا۔ اور ڈیوٹی پر جارہا تھا۔ سامان اس نے ٹیکسی میں رکھا تھا۔ اور پلٹ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا تھا۔ جو مکان کے دروازے میں بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی بیوی کی نظریں اُس پر جمی تھیں ـــــ بچہ اسے جاتے دیکھ کر مچل رہا تھا اور ہمک ہمک کر اس کی طرف لپکتا تھا۔ اور بے تحاشہ رونے لگا تھا ـــــ اس کے دل میں بھی جوار بھاٹا اُمڈ آیا۔ اسکی آنکھیں بھی بھیگ گیئں۔ اس کی بیوی نے بھی پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ وہ لپک کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوگئی۔ بچے کے رونے کی آواز دُور تک اسکا تعاقب کرتی رہی ـــــ اچانک وہ بے چین ہُوا اٹھا ـــــ اوہ! وہ بچے کی ہتھیلی پر تھوکنا بھول گیا تھا۔ اس نے ٹیکسی رکوائی اور بھاگ کر واپس گیا بچے کو سینے سے لگایا۔ وہ چپ ہوگیا۔ اور پھر اس نے آہستگی سے اس کی ہتھیلی پر تھوک دیا ـــــ تاکہ بچہ اسے یاد کرکے اداس نہ رہے۔

اس نے بالکونی پر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اس کا بیٹا سیڑھیوں کی غار میں سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسکول کی یونیفارم پہنے ہوتے اور کتابوں کا بیگ کمر سے لٹکاتے ہوئے ـــــ وہ بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگا ـــــ جہاں سے وہ بس

کی غلاظت میں گھس جائے گا۔ اور پھر مدرسہ پہنچ جائے گا۔ جہاں وہ زندگی کے بڑے بڑے صدمے جھیلنے کا سبق سیکھے گا۔ اور پھر ایک دن زندگی کی کھیتی میں کھاد کے کام آ جائے گا۔

سب طرف دُھندلا، دُھندلا سا ہونے لگا تھا۔ میز پر چائے کے برتن رکھنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کمرے کی طرف پلٹنے سے پہلے سب کی طرف ایک نگاہ دوڑائی ـــــ اب ہر چیز پہلے سے واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ درخت، مکان، سڑک اور دُور کی پہاڑی۔ اُس کا بیٹا آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو چکا تھا۔

دونوں بچّیاں کسمسا کر اٹھ گئیں۔ دونوں نے باہیں بڑھا کر مسکراتے ہوئے اسے قریب سے گذرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے چھوا۔

"آو بٹیا چائے پئیں" اس نے بچّیوں کی محبّت کا جواب پچکار کر دیا۔

بیوی نے پیالوں میں چائے انڈیلی۔ سب چائے پینے لگے۔ سب خاموش تھے۔ کیا خاموشی بے چینی کے درخت کا پھل ہے؟ اُس نے سوچا ـــــ تو کیا ہم سب بے چین ہیں؟ اس نے بے چینی سے سب کے چہروں پر دیکھا ـــــ

باہر کے دروازے پر ذرا سی آہٹ ہوئی۔ سب نے اس طرف دیکھا۔ دروازے کی نچلی دراز میں سے اخبار اندر کو سَرکا ـــــ چھوٹی بچّی لپک کر گئی اور اخبار اٹھا لائی۔ اس نے بچی کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ سرخی پر جو اس کی نظر پڑی تو اُس نے بے چینی سے چائے کا پیالہ میز پر رکھ دیا۔ اور سگریٹ ایش ٹرے میں مَسَل دِیا۔ مگر اُس کی نظریں اخبار پر جمی رہیں۔ وہ اس خبر کی تفصیل پڑھنے لگا تھا جس نے اسے ایک دم سے کمرے اٹھا کر کہیں باہر لا کھڑا کیا تھا۔ اپنی بیوی، اپنی بچّیوں اور اسکول گئے ہوئے بچے سے دُور بہت دُور وہ کسی اجنبی جزیرے میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں لوگ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان گنت لوگ اور پہاڑ کی چوٹی پر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

اسکے چہرے کی زردی اور آنکھوں کی بے چینی کو بچیوں نے اور بیوی نے بھانپ لیا تھا۔

"کیا بات ہے کوئی خاص خبر ـــــ؟" بیوی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ملک میں ایمرجنسی ڈکلیئر کر دی گئی ہے" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا
اور اُس نے محسوس کیا ــــ سب کے چہروں پر دھندلاہٹ چھاگئی ہے۔ اور اس کے
اردگرد کی ہر چیز اپنے وجود کی غار میں پھیلتی دھندلاہٹ میں غائب ہو گئی ہے۔
(اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی)

وہ سیڑھیوں کی غار میں سے نکل کر سڑک پر آگیا ــــ نہایا دھویا ہُوا ــــ نیا لباس
پہنے ہوئے اپنی بچیوں اور بیوی کے ساتھ کچھ آن کہے وعدے کرنے کے بعد وہ اپنے کام پر جا
رہا تھا ــــ کام پر، مگر کہاں ــــ؟

اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا، وہاں سے اسے وہ عمارتیں۔ جن میں
سے ایک میں وہ رہتا تھا ــــ اور ان عمارتوں کے پچھواڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔
پچھواڑے گندے پانی کے پائپ گرتے تھے۔ جو جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے تھے اور گندہ پانی
اُن میں سے کہیں جھرنے کی طرح اور کہیں فوارے کی طرح پھوٹتا تھا۔ جسکی وجہ سے
سب طرف کیچڑ پھیل گیا تھا۔ اُس کیچڑ میں بڑے بڑے چوہے پھدکتے پھرتے تھے۔ بلبلے
اور بساندھ اٹھتی تھی۔ عمارتوں کی پچھلی دیواروں میں سے ان پیڑوں نے سر نکال لیا
تھا۔ جنھیں کاٹ کر میدان صاف کیا گیا تھا۔ اور پھر یہ عمارتیں بنی تھیں وہ سب سرکاری
عمارتیں تھیں اور ان میں سرکاری ملازم ہی رہتے تھے لیکن سرکار سے ملنے والی تنخواہ
سے ان کا گذارہ نہیں ہوتا لہذا وہ اپنے مکان کا آدھا حصّہ یا کبھی کبھی پورا مکان ہی آگے
کسی کو دے دیتے ہیں۔ اور خود کسی جھونپڑے میں جاکر رہنے لگتے ہیں ــــ اور جھونپڑے
سارے شہر میں پھیلے ہوتے ہیں ــــ اُس نے سوچا پیڑ جو دیواروں میں سے جھانک رہے
ہیں دھیرے دھیرے تناور ہو رہے ہیں۔ اور جب وہ پوری طرح اپنے بازو پھیلادیں
گے تو ان دیواروں کا کیا ہوگا؟ ــــ اور ان سرکاری مکانوں کا کیا ہوگا اور ان
میں رہنے والے سرکاری اور غیر سرکاری مکینوں کا کیا ہوگا۔؟؟؟ ــــ یہ سارے کا
سارا انتظام غیر قانونی تھا ــــ اور وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی یہ غیر قانونی کام کرنے پر

مجبور تھا۔ اور اگر وہ یہ غیر قانونی کام نہ کرتا تو اُس کے بیوی اور بچے کہاں رہتے۔؟ اور وہ آدمی جس کے مکان میں وہ رہ رہا ہے اس کے بچّے کیا کھاتے ——؟ کیا قانون کی حد میں رہ کر زندگی گذاری جا سکتی ہے۔؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ سب لوگ اپنے بچّوں کو لیکر بالکونیوں میں کھڑے ہیں۔ اور سامنے والے میدان میں آگ لگی ہے۔ آگ کس چیز کو لگی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو رہا ہے —— لیکن الاؤ بہت بڑا ہے۔ شعلے کافی بلندی تک اُٹھ رہے ہیں۔ اور اُن شعلوں میں سب کے تمتماتے ہوئے چہرے —— حیران اور خوفزدہ سے نظر آتے ہیں۔ —— پھر اچانک ایک بالکونی گرتی ہے۔ اُس کے ساتھ ہی چیخ و پکار بلند ہوتی ہے۔ پھر دوسری بالکونی گرتی ہے چیخ و پکار اور بلند ہوتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے سب بالکونیاں گرنے لگتی ہیں۔ اور ایک کہرام مچ جاتا ہے اور آگ کے شعلے مزید بلند ہوتے ہیں۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ انسانی جسم اُس آگ میں جل رہے ہیں —— وہ میدان میں الاؤ کے گرد کھڑا یہ سب دیکھ رہا ہے اور پھر اچانک اسے اپنی بیوی اور بچوں کا دھیان آتا ہے۔ وہ اُنھیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ انھیں پکارتا ہے۔ اور بے چینی سے اِدھر اُدھر پھدکتا پھرتا ہے۔ کیچڑ میں پھدکنے والے چوہوں کی طرح۔ لیکن اسے وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے —— وہ نہ گری ہوئی بالکونیوں کے ملبے میں دکھائی دیتے ہیں اور نہ الاؤ میں جلتے ہوئے انسانی جسموں میں —— اور وہ اچانک ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اور اُس کی آنکھ کُھل جاتی ہے۔

اُس نے اپنی نظر عمارتوں پر سے ہٹا کر سامنے دُور تک جاتی ہوئی سُرمئی سڑک پر ٹکا دی —— وہ ایک عجیب لمحہ تھا کہ سڑک بالکل خالی تھی۔ نہ کوئی بس نہ موٹر نہ سائیکل نہ کوئی آدمی اور نہ کوئی چرند یا پرند —— اُسے کہاں جانا ہے —؟ اُس نے سوچا۔

"کہیں بھی تو نہیں —" اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔

"عجیب احمق آدمی ہے۔ جب کہیں جانا ہی نہیں تو پھر گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

کلائے صاب ـــــ آج ایک سگریٹ تو پلاؤ "۔

ایک آواز اس کے سارے وجود کے ساتھ ٹکرائی اور پھر کسی سانپ کی طرح اس کے سارے جسم کے ساتھ لپٹ گئی ـــــ اُس نے پلٹ کر دیکھا ـــــ سامنے " مہی پت " کھڑا تھا۔ سیاہی مائل مہی پت اپنے سفید دانت نکالے ایک ہاتھ سے سر کھُجاتا ہُوا اور دوسرا ہاتھ اُس کی طرف پھیلاتے اس کے قریب کھڑا سگریٹ مانگ رہا تھا۔

" ہاں لو " اس نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اُس میں دو ہی سگریٹ تھے ایک اس نے مہی پت کو دیدیا۔ دوسرا پیکٹ ہی میں رہنے دیا۔ اور پیکٹ بند کرکے اس نے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

" یہ کون سا سگریٹ ہے ؟ صاحب تم ٹرپل فائیو نہیں پیتا۔ مہی پت نے سگریٹ کو گھُما پھرا کر بغور دیکھا اور پھر اُسے ہونٹوں میں دبا کر ماچس کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔

" نہیں بھئی ـــــ میں ٹرپل فائیو 555 ایفورڈ نہیں کرسکتا " اس نے لائٹر سے اس کا سگریٹ جلاتے ہوئے جواب دیا ـــــ مہی پت ہنسنے لگا۔

" ہم نے سالا ٹرپل فائیو بہت پیا ہے "

مہی پت کی بات سن کر اُس نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اور مُسکرا دیا ـــــ کچھ بولا نہیں۔ کیوں کہ بولنا بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو ساری زندگی بھگتتا رہا ہے۔ لیکن مہی پت کے معاملے میں تو خاموش رہنا، اُس کی ہاں سے ہاں ملانا اور بے معنی سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلا دینا اور بھی اچھا ہے۔

وہ جن عمارتوں میں سے ایک میں رہتا ہے وہ سرکاری ہیں۔ ان میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ غیر قانونی طور پر رہتے ہیں۔ اور ان عمارتوں کے ساتھ ہی جھونپڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ جھونپڑیاں بھی غیر قانونی طور پر سرکاری زمین پر بنی ہیں۔ اُن میں مختلف قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، چھوٹی موٹی نوکریاں کرکے پیٹ پالنے والے، ناجائز شراب کا دھندہ کرنے والے، جسم بیچ کر اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش کرنے والی طوائفیں، ٹیکسی ڈرائیور،

اور مہی پت جیسے غنڈے۔

مہی پت اپنی ماں بڑے بھائی اور بھاوج کے ساتھ انھیں جھونپڑیوں میں سے ایک میں رہتا ہے۔ اسکا بھائی شاید کسی سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری دفتر میں چپراسی ہے۔ اور مہی پت محلے کے آوارہ لونڈوں کا سرغنہ ہے۔ جو سارا دن ان عمارتوں کی سیڑھیوں میں بیٹھے جوا کھیلتے رہتے ہیں۔

جوا کھیلنے کیلئے پیسہ چاہیئے اور پیسہ حاصل کرنے کیلئے وہ چھوٹی موٹی چوری کر لیتے ہیں۔ محلے میں اگر سامان بیچنے والے کسی ٹھیلے والے کو لوٹ لیتے ہیں، یا پھر رات کو دیر سویر کام پر سے آنیوالے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کی جیبیں خالی کروا لیتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی دو چار بار ہوا کہ انھوں نے کسی راہ جاتی اکیلی عورت کے زیور اتار لئے ـــــ مہی پت کا ذریعہ معاش یہی ہے۔

یہاں رہنے والے سبھی لوگ مہی پت اور اُس کے ساتھیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ سوائے اُس کے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مہی پت اُس سے ڈرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اندر ہی اندر وہ مہی پت سے ڈرتا ہے۔ ان کی دوستی اتنی ہی ہے کہ کبھی کبھی وہ مسکرا کر اُس سے سگریٹ مانگ لیتا ہے اور وہ مسکرا کر اُسے سگریٹ دے کر اس کا سگریٹ سلگا دیتا ہے۔ اُس علاقہ میں رہنے والے سبھی لوگ مہی پت اور اسکے ساتھیوں سے خوفزدہ رہتے ہیں اور دل ہی دِل میں نفرت کرتے ہیں۔ یہی حالت اس کی بھی ہے۔ لیکن چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر اُس نے کہا۔

" مہی پت تمہیں معلوم ہے آج سے ایمرجنسی لگ گئی ہے۔"

" کیا مطلب ؟"

" یہی کہ ملک کی جو حالت اتنی خراب ہو گئی تھی اسے سدھارنے کے لیے قدم اٹھایا گیا ہے۔

" ملک یعنی مہابلیشور ـــ جدھر کا ہم ہے"

" نہیں بھائی ـــ مہابلیشور ہی نہیں یہ سارا کا سارا ملک ہمارا ملک ہے۔

" صاب سچ بات بولوں ہم تمہارے کو بہت ریسپیکٹ RESPECT دیتا تھا۔

ہمکو سب نے بولا تم لکھے لا، پڑھے لا آدمی ہے، رائیٹر ہے، نیتں تو کبھی کا تمہارا گھڑی اتار لیتا
پن آج سے تمہارا ریسپیکٹ کھلاس۔" مہی پت نے زوردار قہقہہ لگایا۔
اُسکی تو جان ہی نکل گئی۔ اُسے لگا آج کے بعد اُس کی گھڑی، گھر، بیوی بچے سب
غیر محفوظ ہوگئے ہیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مہی پت بے نیازی سے سگریٹ کا ایک گہرا
کش لگا رہا تھا۔
" کیوں ــــ؟" اُس نے ہمّت کر کے اپنی عزّت مہی پت کی نظروں میں ختم ہو
جانے کا کارن پوچھ ہی لیا۔
مہی پت نے اسے انتہائی فلسفیانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔
" اپن سالا ایک بات جانتا ہے۔ اس ملک کا کچھ ہونے والا نہیں"
یہ کہتے ہوئے مہی پت نے اپنا سینہ ذرا اور پھیلایا ــــ اور پھر زور سے سگریٹ
کا دھواں باہر پھینکا۔ اور بولا۔
" کچھ بھی ہونے دو ــــ اپن سالا کسی سے نہیں ڈرتا ــــ نہ ایمرجنسی سے نہ
اُس کے باپ سے"
اور پھر اچانک مہی پت کی نظر سڑک پر بھاگتی ہوئی اس کار پر پڑی جو تیزی سے ہماری
طرف آرہی تھی۔ اور وہ یکدم خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے سگریٹ اپنے پیچھے چھپالیا۔ اور
پھر سڑک کنارے باڑھ پھلانگ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے منہ سے جو آخری
الفاظ نکلے ــــ وہ تھے۔
" باپ رے وہ آگیا۔ باپ!"
اُس نے جلدی سے اُس کار کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس میں بیٹھ کر جانے والے
کی شکل نہ دیکھ سکا۔ لیکن اتنا دکھائی دیا کہ جو شخص بھی اس کار کی پچھلی سیٹ پر
بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی چاند چمک رہی تھی۔
تھوڑی دیر وہ وہاں کھڑا اس کار کو اور غائب ہو جانے والے مہی پت کو دیکھنے
کی کوشش کرتا رہا۔ جب سب کچھ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ سیدھا سڑک پر چلنے لگا۔

ٹن ٹن ٹن ـــــ

" کدھر جائے گا صاحب۔؟ ٹکٹ!"

" کون میں . . . . ؟ ہاں ــــ میں کدھر جاؤں گا ــــ؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور پھر گھبرا گیا۔ مجھے کدھر جانا ہے ــــ مجھ سے سوال کیا جا رہا ہے۔ اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

" یہ بس کدھر جائے گی؟ میں نے کنڈکٹر سے جواب مانگا۔

" اوہو ــــ کیسا آدمی ہے۔؟ تم اپنا بات کرو ــــ یہ سرکاری بس ہے کدھر جائے گا۔ کدھر نہیں جائے گا۔ تم سے مطلب ــــ؟" کنڈکٹر نے بھی ٹنک مزاجی کا ثبوت دیا۔

" تو ٹھیک ہے۔ کہیں کا بھی ٹکٹ دے دو ــــ کتنے پیسے؟" میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

" ایک پانچ" اس نے میری طرف حقارت سے دیکھا۔ اور پیسے لئے ٹکٹ دیا اور آگے بڑھ گیا۔

" اب چپ بھی رہو ــــ کیوں اپنی جہالت کا مظاہرہ کر رہے ہو؟" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک نے دبی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا ــــ مجھے آواز جانی پہچانی سی لگی۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ اس کے دوسرے ساتھی کی مری ہوئی آواز سنائی دی۔

" لیکن ہم نے یہ سب کبھی نہیں چاہا تھا ــــ کبھی نہیں مانگا تھا۔"

" پھر وہی بات اب کیا ہو سکتا ہے۔ تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ پہلے نے پھر قریباً ڈپٹ کر اور آواز دبا کر کہا۔

" ہاں کر ہی کیا سکتے ہیں ہم ــــ؟ ہم بے بس اور مجبور کر دیئے گئے ہیں ــــ نامرد بنا دیئے گئے ہیں۔"

" دیکھو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو ــــ" پہلے نے قدرے درشتی سے سمجھایا۔

"میں کچھ بھی تو نہیں کہہ رہا ـــــ اپنے مرے ہوؤں کا ماتم ہی تو کر رہا ہوں" دوسرے نے اتنی گلوگیر آواز میں جواب دیا کہ مجھے لگا ـــــ وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا ـــــ میں ان دونوں کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ میرے لئے اجنبی تھے۔ میں مطمئن ہو گیا۔ اور پھر بس کی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سرکاری بس اپنی مخصوص رفتار سے ـــــ مخصوص راستے پر چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ـــــ موڑ پر ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔ بالکل نیا لگ رہا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"دِس از دی ایرا آف ڈسپلن" THIS IS THE ERA OF DISCIPLINE

بس کافی آگے نکل آئی تھی ـــــ شہر پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ بھیڑ بھاڑ ختم ہو گئی تھی۔ شور و غل دَم توڑ چکا تھا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ منزل ابھی نہیں آئی تھی۔

"ٹن ۔ ٹن ۔ ٹن ۔ لاسٹ اسٹاپ" کنڈکٹر نے اعلان کیا"

"یہ ہم کہاں آگئے ہیں ـــــ؟" میں نے سوال کیا ـــــ (اپنے آپ سے یا کنڈکٹر سے؟) کنڈکٹر نے جواب دیا۔

"وہ سامنے دیکھو ـــــ سب ادھر ہیں"

میں نے دیکھا ایک وسیع میدان تھا جس میں بہت بھیڑ جمع تھی ـــــ پیچھے ایک پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر سے دھواں اٹھ رہا تھا ـــــ ایک طرف موٹر کاریں کافی تعداد میں پارک ہوئیں تھیں۔

میں بس میں سے اُترا۔ اور ان موٹر کاروں کے قریب سے گزرتا ہوا اس میدان کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک کار پر پڑی ـــــ میں نے اس کار کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا ـــــ میں اس کے رنگ سے اسے پہچان گیا تھا ـــــ وہ اب بالکل خالی تھی اور اس کے تمام دروازے کھڑکیاں لاک تھے ـــــ مگر میں نے جب پہلے دیکھا تھا ـــــ تو وہ سڑک پر بھاگ رہی تھی ـــــ اور اس کی پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا تھا۔ جس کا چہرہ میں نہیں دیکھ سکا تھا ـــــ لیکن اس کی چاند چمک رہی تھی ـــــ میں اور آگے بڑھا اور دیکھا کہ وہاں جتنے کھڑے ہیں سب نے اپنے ہاتھ تعظیماً

اٹھا رکھے ہیں ـــــ اور پہاڑ کے دامن میں سب کے سامنے ایک بڑی سی میز بچھی ہے جسے ایک سفید میز پوش سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ اور اس پر ایک گلدان رکھا ہُوا ہے۔ جس پر رنگ برنگے پھول ہیں۔ اور میز کے پیچھے کچھ کرسیاں بچھی ہیں۔ ان پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں ـــــ اور ان سب کے درمیان ایک سرخ و سپید چمکتے چہرے والا آدمی بیٹھا ہے۔ جس کے سر اور چہرے پر ایک بھی بال نہیں۔ اور اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ پہن رکھا ہے ـــــ اور اس کے ہونٹ ایسا زاویہ بنا رہے ہیں۔ جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ اس کی چاند چمک رہی ہے۔

تو..... تو کیا یہی ہے وہ ـــــ؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اچانک میری پسلی میں کسی نے ٹہوکا دیا ـــــ میں نے پلٹ کر دیکھا ـــــ وہ ہاتھ اوپر اٹھائے میرے قریب کھڑا تھا اور دبی زبان میں کہہ رہا تھا ـــــ "تم۔ تم یہاں کیوں آئے ـــــ؟ میں جو آ گیا تھا۔"

دراصل اس سے میری ملاقات بہت عرصہ پہلے طے ہو چکی تھی ـــــ ہم کہیں ملنے والے تھے لیکن رانڈے ووز (RENDEZVOUS) یہ ہو گا یہ معلوم نہیں تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا ـــــ "تم ہی سے تو ملنے آیا ہوں۔"

"مگر یہاں ـــــ؟" اس نے پوچھا۔

"بس میں بیٹھا تھا۔ بس یہاں لے آئی ـــــ مجھے کیا معلوم تم بھی یہیں ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں ـــــ میں یہاں ہوں گا۔ اس کا مجھے بھی علم نہ تھا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"وہ کون ہے؟ جس کی چاند چمک رہی ہے۔" میں نے سوال کیا۔

"معلوم نہیں ہو سکا ـــــ لیکن وہ ہر موقعہ پر موجود ہوتا ہے۔ اور اسی طرح مسکراتا رہتا ہے۔ جیسے یہ سب اس سے پوچھ ہی کر اس کی اجازت ہی سے ہو رہا ہو ـــــ" اس نے جواب دیا۔

"آؤ ہم یہاں سے چلیں ـــــ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

" یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یہاں سے صرف سرکاری بس ہی ہمیں لے جاسکتی ہے۔ اور ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا ہوگا۔"

" یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"؟

" یہ آج سے نہیں ــــــ شروع سے ہو رہا ہے ــــــ ایسے موقعہ پر لوگ ہاتھ اٹھا کر اس میدان میں اکھٹے ہوتے ہیں۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا۔

" مجھے وہ خواب یاد آگیا ــــــ بالکل ایسا ہی تھا ــــــ پہاڑ کی چوٹی پر سے دھواں بھی نکل رہا تھا۔ اور پھر ایک اور خواب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوم بھور بھوا سُیہا ــــــ تت سویتر، ورنیئم، بھرگو دیواسیہ، دہی مہی دھیو یونا پر چو دیات۔"

گائیتری منتر گاتے ہوئے۔ رِشی مُنیوں کے چہرے والے۔ دیوی دیوتاؤں کے شریروں والے بہت سے لوگ اپنی بھوری، سفید گائیوں اور ریلوں کے ریوڑ ہانکتے ہوئے چراگاہ میں گھس آتے ہیں ــــــ اور میلوں تک پھیلی ہریالی اور بہتی ہوئی ندیاں اور نرتیہ کرتے ہوئے جھرنے اور سفید برف کا مکٹ پہنے پربت دیکھ کر گدگد ہو اٹھتے تھے اور انھوں نے اور ان کی استریوں نے اور انکے بچّوں نے سوریہ دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا کر پرارتھنا کی تھی۔

" اے ہمارے سنسار میں پرکاش کرنے والے سوریہ دیو

اے ہمیں جیون پردان کرنے والی اوشا

ہمارے پتھ پردرشک

تم نے ہمیں مارگ دکھایا اور یہاں تک پہنچا دیا

ہماری گائیوں اور ریلوں کو اننت ہری ہری گھاس دی۔

اور ہمارے سواستھ کیلئے جڑی بوٹیوں کا اپرمیت بھنڈار

اور لاکھوں ورشوں میں پھیلی ہوئی دھرتی ہمیں بیج بونے کے لئے دی۔

ہم تمہاری اُپاسنا کرتے ہیں۔

" ادم بھور بھوا سہا . . . . . . "

اور پھر وہ سب خاموشی سے دیوانہ وار اس گھاس میں بھاگے اور اُنکے لباس اُس سے چھو کر سبز ہو گئے اور سورج غروب ہو گیا۔ اور وہ گھاس کے رنگ کے ہو گئے ـــــ اور دُور گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز آئی ـــــ اور میں نے خواب میں دیکھا کہ ان گنت شعلیں اندھیرے میں رقص کرتی ہوئی بڑھی چلی آ رہی ہیں۔

الیگزینڈر بیمار ہے۔ جہلم میں بہتا ہوا برفیلا پانی اداس ہو گیا ہے اور سکندر کا گھوڑا کنارے پر کھڑا اپنی مغموم آنکھوں سے اس کشتی کو دیکھ رہا ہے جس میں ملیریا کا مریض یونان واپس جا رہا تھا۔ اپنی تھکی ہوئی فوجوں کے ساتھ ـــــ گھوڑا بیاکل ہُوا اٹھا ہے۔ اس نے پیر پٹخنے شروع کئے ہیں۔ اور دھرتی اس کے سموں کے نیچے کچلتی جا رہی ہے کشتی جہلم کی سطح پر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی ہے۔ گھوڑے کی سموں کے نیچے کچلی ہوئی زخمی دھرتی نے ہاتھ اٹھا کر پوچھا ہے ـــــ "تم نے مجھے فتح کر لیا سکندر۔ ؟"

بدھم شرنم گچھامی ـــــ دھمم شرنم گچھامی ـــــ سنگھم شرنم گچھامی

" ہر دیہ جیتنا ہے ـــــ شریر نہیں ـــــ ہر پربت کے ہردیہ میں گوتم کی پرتیما ازکت کرنا ہے۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن ـــــ اس کے سندیش پہنچانا ہے ـــــ "

یہ آوازیں سارے میں گونج رہی ہیں۔ ان گنت ننگے پاؤں کھردری، پتھریلی زمین پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور سارا واتاورن بھگوا ہو گیا ہے۔

" شانتی، شانتی۔ "

آدی شنکراچاریہ نے نیام سے تلوار نکال کر فضا میں لہرائی اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ جنگل نے جھک کر اسے پرنام کیا۔ اور اس نے بلند آواز سے للکار کر کہا۔

" بھج گووندم ... بھج گووندم ۔ گووندم بھج موڑھ منے۔ "

لوٹ چلو، گھروں کو لوٹ چلو ـــــ اے بھٹکے ہوئے لوگو ـــــ زندگی جنگلوں میں بھٹکنے کے لئے نہیں، بھوگنے کے لئے ہے۔ زندگی ـــــ کھیتوں میں اُگے ہوئے

اناج کی بالیوں میں ہے ـــــ پوتر ندیوں میں بہتے ہوئے پانیوں میں ہے۔ استری کے تپتے ہوئے شریر میں ہے ـــــ آؤ میں تمہیں واپس لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ اور لوگوں نے اس کی طرف دیکھا اس کے پرکاش متی چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں سے پھوٹتے ہوئے جادو کے اسیر ہو گئے ـــــ بستیاں پھر سے بس گئیں۔

صحرا تپ رہا تھا ـــــ کربلا میں پھیلی ہوئی ریت کا ایک ایک ذرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ حسینؑ نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا ـــــ وہ پیاس سے نڈھال تھے۔ اور ان کے جسم زخموں سے چور تھے۔

"کیا میں زخمی ہوں؟" حسینؑ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور اپنی گرفت شمشیر کے ہتھے پر اور مضبوط کر دی۔ اور جسم پر پھیلے ہوئے زخم مسکرائے "اللہ اکبر ـــ اللہ اکبر" ـــــ فضا میں نعرے گونجے۔

"نہیں تو" انھوں نے جواب دیا۔ اور اس کے زخموں کے پیاسے ہونٹ خون سے تربتر ہو گئے۔۔۔۔ کیا یہی ہمارا راندے ووُز RENDEZVOUS ہے۔؟ میں نے اس سے سوال کیا۔

"شاید یہی ہے ـــــ!" اس نے اپنی نظریں آسمان پر گاڑ کر جواب دیا ـــــ اور پھر ہم دونوں نے اسکی طرف دیکھا وہ بڑی میز کے پیچھے ان کے درمیان بیٹھا اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے بدستور مسکرا رہا تھا۔ اس کا سر اور اس کا چہرہ بالوں سے بالکل عاری تھا۔ اور اسکی چاند چمک رہی تھی۔

ہم نے پلٹ کر معنیٰ خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس ساری بھیڑ کے ساتھ شامل ہو کر اپنے بھی ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

جب بس اس جگہ پہنچ گئی تو ہم دونوں اتر گئے ـــــ جہاں ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔

دِس از دی ایرا آف ڈسپلن۔

تھوڑی دیر ہم چلتے رہے پھر میں نے پوچھا "کہاں چلیں گے؟"

"کہیں بھی اب تو سب ایک سا ہے ــــ چلو آرٹ گیلری چلتے ہیں" اس نے تجویز رکھی۔

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔ اور دوسرے ہی پل ہم آرٹ گیلری کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وہاں سب موجود تھے ــــ ہم بھی جاکر بیٹھ گئے۔ ہم دونو نے گہری سانس لی ــــ آرٹ گیلری میں بنا رستوران بھرا ہوا تھا۔ سب کھا پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

"اُس دن۔۔۔۔۔" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کیا بات ہے" اس نے پوچھا۔

"اُس دن تم نے کہا تھا نا ــــ کہ زندگی کا سات بٹہ اُنیس ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب کیا تھا" میں نے پوچھا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"تم بھی عجیب چغد ہو" اتنا بھی نہیں سمجھے۔؟"

"نہیں"

"ارے بھائی ــــ دستور کی انیسویں مد کے تحت جو ہمیں سات آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔ ان کی بات کر رہا تھا" اس نے وضاحت کی۔

"تو۔۔۔۔ تو ہمیں کوئی آزادی بھی ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"کیوں نہیں" اس نے جواب دیا اور پھر بتانے لگا۔

"بھونکنے کی آزادی ــــ ایک دوسرے کو کاٹنے کی آزادی ــــ پڑوسی کے ساتھ لڑنے کے لئے اپنے گھروں میں پتھر جمع کرنے کی آزادی ــــ گندگی میں اپنی مرضی کے مطابق لوٹنے کی آزادی ــــ بیماری کی حالت میں تڑپنے کی آزادی ــــ دوسرے کی دیوار پر اپنی گالی لکھنے کی آزادی ــــ اور مرنے کے بعد اپنے عقیدے کے مطابق دفن ہونے یا آگ میں جلنے کی آزادی"

"بس، بس اتنا کیا کم ہے" میں نے مطمئن ہو کر چائے کا آرڈر دیا۔

"تم بات نہیں سمجھے ــــ" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب۔؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اب یہ سات آزادیاں بھی نہیں رہیں ــــ یوں تو ہیں، لیکن کسی بھی ایک آزادی کے استعمال سے پہلے پوچھنا پڑے گا۔"

میں نے سوچا ــــ میں مہی پت سے پوچھوں گا۔ کہ وہ کون ہے جسکی چاند چمکتی ہے۔ اور وہ اس سے کیوں ڈر گیا تھا۔ اور وہ وہاں بھی کیسے موجود تھا۔

لیکن مہی پت پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا ــــ اس کے ساتھی بھاگ گئے۔ میدان بالکل صاف تھا اور سب طرف چین کی بنسری بجنے لگی تھی۔ نہ ہڑتال نہ نعرہ نہ راہزنی نہ رشوت اور نہ ہی زنا بالجبر۔

وہ نہ جانے کیوں بے چین ہو اٹھا۔

(اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی)

وہ سب کتنے اچھے اور بھلے لوگ تھے ــــ اپنے ملک سے انھیں بے انتہا پیار تھا ــــ وہ جھک جھک کر مٹی اٹھاتے تھے اور اپنی پیشانیوں پر لگاتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے بدستور دھواں اٹھ رہا تھا ــــ وہ سب پھر میدان میں اکٹھے ہوئے تھے۔ میں اور وہ سرکاری بس میں بیٹھ کر اس جگہ پہنچے جہاں کبھی ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا ــــ جس پر لکھا تھا۔

"دِس از دی ایرا آف ڈسپلن۔"

بورڈ تو اب بھی موجود تھا۔ مگر اس پر لکھا تھا۔

"وی ہیوون دی سیکنڈ فریڈم"

سرکاری بس دندناتی ہوئی میدان تک پہنچی۔ باقی سب کے ساتھ ہم دونوں بھی اترے اور میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ کافی ساری موٹر کاریں آج بھی پارک ہوئی تھیں اور اچانک میری نظر اس موٹر کار پر پڑی۔۔۔۔

" اس کی گاڑی بھی موجود ہے" میں نے اس سے کہا۔

اس نے نظریں گھما کر اس کی گاڑی کو دیکھا ــــ اس کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور وہ بالکل چپ چاپ دوسری بہت سی گاڑیوں کے ساتھ موجود تھی۔

وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

سب نے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ ویسی ہی بھیڑ تھی اور ایک لمبی میز پر سفید میز پوش بچھا تھا جس پر تازہ پھولوں سے بھرا ایک گلدان رکھا تھا۔ کئی لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ان کے درمیان حسبِ معمول وہ موجود تھا ــــ اور اسکی چاند حسبِ معمول چمک رہی تھی۔ ــــ اور ہونٹ حسبِ معمول ایسے زاویہ پر تھے۔ کہ لگتا تھا۔ کہ وہ حسبِ معمول مسکرا رہا ہے۔

" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اصل آدمی ہے" اس نے پھسپھسا کر میرے کان میں کہا۔

" ہونہہ ــــ یہی لگتا ہے" میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

" مگر وہ ہے کون ــــ؟ جو آج بھی موجود ہے۔ اور مہی پت جس سے بہت ڈرتا ہے۔ اور اس کی چاند چمک رہی ہے ــــ" اس نے آہستہ سے کہا" اور اس کے جسم پر ایک بھی بال نہیں ــــ بڑا چکنا جسم ہوگا اس کا مچھلی سے بھی زیادہ چکنا" وہ بُدبُدایا۔

○

میں نے گھر کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے نیچے دیکھا۔ سڑک پر کافی گہما گہمی تھی۔ ــــ سرکاری بسیں اور موٹر کاریں اور آدمی ایک دوسرے سے بچتے بچاتے آجا رہے تھے۔ کہ دُور سے مجھے وہی موٹر کار آتے دکھائی دی۔ میں چوکنّا سا ہو گیا۔ پھر وہ کار میرے گھر کے بالکل قریب سڑک کے کنارے آکر رُکی۔ اس کا پچھلا دروازہ کھُلا۔ اور اس میں سے مہی پت نکلا۔ میں نے دیکھا پچھلی سیٹ پر وہ بھی بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور اس کی چاند چمک رہی تھی۔

مہی پت نے باہر آکر اس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور تعظیماً سر جھکا دیا۔ موٹر کار کا انجن اسٹارٹ ہُوا۔ مہی پت نے دروازہ بند کیا۔ اور

کار روانہ ہو گئی۔

ایکاایکی مہی پت کے باقی ساتھی ـــــ عمارتوں کی سیڑھیوں کی پناہ گاہوں سے نکل کر آگے بڑھے۔ اور انھوں نے خوشی کے نعرے بلند کئے۔ باری باری مہی پت سے گلے ملے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا ـــــ سارے مکانوں کی بالکونیاں ویران ہو گئیں ہیں۔ اور بالکونیوں میں کھُلنے والی کھڑکیاں خوفزدہ ہو گئی ہیں۔

"کیسا ہے صاحب؟" مہی پت نے دانت نکال دیئے اور میری طرف ہاتھ لہرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کیسے ہو ـــــ؟" میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے چہرے پر خواہ مخواہ مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا۔

"اپن بھی ٹھیک ہے۔ ہمارا باپ ہمکو لے آیا۔ ایمرجنسی EMERGENCY ختم ہو گیا نا؟" اس نے نیچے کھڑے کھڑے ہی بلند آواز سے جواب دیا اور وہ سب ناچتے گاتے ہوئے جھونپڑوں کی طرف بڑھ گئے۔

اسی رات میرے ساتھ والی عمارت کے ایک فلیٹ میں چوری ہوئی ـــــ گھر میں جو کچھ بھی تھا جاتا رہا۔ پولیس آئی اور سب سے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھ تاچھ کرنے لگی مگر کسی نے بھی اپنا جرم قبول نہیں کیا۔ پولیس انسپکٹر نے اس گھر کے مالک کو کہا۔

"اگر پھر کوئی ایسی واردات ہو جائے تو فوراً پولیس اسٹیشن میں اطلاع دینا" اس گھر کے مالک نے انسپکٹر کا حکم بجا لانے کا پورا پورا یقین دلایا۔

میں گھبرا کر نیند سے بیدار ہُوا۔

"کیا ہُوا ـــــ؟" میری بیوی نے میرے چہرے پر گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا ہی عجیب خواب دیکھا ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیا تھا وہ ـــــ" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

" میں نے دیکھا ـــــ بے جان بجو کا درانتی لیے کھیت کاٹ رہا تھا، اور بہت سے بیل ہماری چراگاہ چٹ کیے جا رہے تھے۔"

" اوہ ـــــ! اب کیا ہوگا ـــــ؟ میری بیوی خوفزدہ ہو گئی۔

" صبح اخبار آیا تو معلوم ہوا ـــــ اندرا گاندھی بھاری ووٹوں سے جیت گئی ہیں۔ میری بیوی اور بچے بہت خوش ہوئے ـــــ شکر ہے بھگوان کا ـــــ اب چین کی سانس تو لے سکیں گے۔" میری بیوی بدبدائی۔

اس شام ہم سب ڈھول تاشے بجاتے ہوئے اس میدان کی طرف جا رہے تھے۔ ساری سرکاری بسیں بھری ہوئی تھیں ـــــ بڑا جوش و خروش تھا۔ میدان لبالب بھرا ہُوا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے بدستور دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور پھر اچانک مجھے وہ مل گیا

" کیا ہمارا راندے وُوز یہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

" شاید یہی ہے۔" اس نے فکرمندی سے جواب دیا۔

بہت سی موٹر کاریں پارک ہوئی تھیں ـــــ اور ان میں وہ کار بھی تھی بخاموش بند دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ۔

مجھ پر اور اس پر جیسے رقت طاری ہو گئی ـــــ ہم دونوں بھاگتے ہوئے بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے ـــــ بڑی سی میز بچھی تھی اس پر سفید میز پوش تھا اور گلدان اور ساری کرسیاں خالی تھیں۔ سوائے بیچ کی ایک کرسی کے ـــــ اور اس کرسی پر وہ بیٹھا تھا ـــــ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا ـــــ چہرے پر مسکراہٹ تھی اور چاند چمک رہی تھی ـــــ سب لوگوں نے تعظیماً ہاتھ اٹھا رکھے تھے ـــــ اور یہی پت گلدان میں تازہ رنگا رنگ پھول سجا رہا تھا۔

" بات بالکل صاف ہو گئی ہے۔" اس نے دبی آواز میں میرے کان میں کہا اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ اپنی کرسی پر سے مسکراتا ہوا اٹھا ہے۔ اور اس نے

مائیک پر ہاتھ رکھا ہے۔ اور مسکراتے ہوئے زندگی میں پہلی دفعہ یوں گویا ہوا ہے۔

"میں آپ لوگوں کی ساتویں آزادی بحال کرتا ہوں"۔

اتنا سننا تھا کہ سب لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ نعرے لگانے لگے۔ اور اس قدر ہنگامہ ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

میں اسکی طرف لپکا اور وہ میری طرف لپکا ـــــ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے بھاگنے لگے ـــــ حتیٰ کہ ہم ایکدوسرے سے بیگانہ ہو گئے ـــــ اور اپنی اپنی پہچان کھو بیٹھے۔ اور ہمارے ہاتھ آپ ہی آپ چھوٹ گئے ـــــ

اس شام اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ ساحل کی طرف نکل گیا ـــــ خوب رویا اور پھر سورج کا قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

بس اسٹاپ پر کھڑا وہ اس بس کا انتظار کر رہا تھا جو اس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کونسی بس ہے۔؟ اور اس کا گھر کہاں ہے۔؟

میرا چہرہ بالکل سپاٹ ہے۔ اور میں گھبرایا ہوا ہوں۔" بے چینی ؟" ـــــ "ہاں بے چینی۔!!"

(اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی)

بُھوکا

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت میں سے اُبھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اُس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جوان نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہُوا، اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اُس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے، بس ایسا ہی کچھ اُس کے ساتھ بھی ہُوا تھا ـــــ اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر اُن کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اُس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔

اُن دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلہ میں مارے جانے والے کے۔ اب اُن سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا، اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اُس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سُرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنوئیں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اُس کی بڑی بہو کنوئیں سے پانی نکال نکال کر اُن پر باری باری اُنڈیلتی جا رہی تھی اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اچھال رہے تھے ـــــ چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیر میں ڈال رہی تھی۔ اور ہوری انڈ

کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آگیا۔

"سب تیار ہیں۔؟" اُس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

"ہاں باپو ——" سب بچے ایک ساتھ بول اُٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیے اور اُن کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا —— سب جھوٹ بول رہے تھے —— اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ اُن کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اُسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے، پوتیاں اور بہوئیں —— ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جُٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے —— اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

اُن کا کھیت لہلہا اُٹھا تھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا سمے آپہنچا ہے۔ نہ اہلمند کی دھونس نہ بنیئے کا کھٹکا نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ —— اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اُٹھے۔

"چلو باپو" اُس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیز بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آگئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرّت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکّی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچّوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچّے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے ــــ جو جیپ گاڑی کے پہیّوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب کسان کی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں، چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھُلے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے ایک کُتا بے فکری سے سویا ہُوا تھا۔ دُور طویلے میں کچھ گائیں، بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دُور دُور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے ــــ ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دُور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر، چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا۔ جس میں جھونا تک کر انگڑائیاں لے رہا تھا وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دُور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کپڑے گھاس پر رینگ رہے ہوں۔ وہ سب کھیت کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے آگے تھل تھا۔ دُور دُور تک پھیلا ہُوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوڑی بے جان مٹّی تھی جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا۔ اُو مٹّی یوں بھربھری ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا، جب تک بچّے جوان ہوں وہ تھل اُس کے کھیت تک نہ پہنچے۔ اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصّہ بن چکا ہو گا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اُس پر ہوری اور اُس کے خاندان کے

لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں ... ...

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے اُن کے پاؤں مٹی سے اَٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا بہنے کو —— اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب وغریب نقش ونگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اور سامنے لہلہاتا ہُوا کھیت نظر آرہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا —— فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھڑی اناج سے۔ پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ اُن سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھُرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

''ابے کون ہے ... ے ... ے —— ؟''

اور پھر سب نے دیکھا اُن کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔

اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلّایا۔

''ابے کون ہے رے —— بولتا کیوں نہیں —— کون فصل کاٹ رہا ہے میری —— ؟''

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آچکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سڑاپ سڑاپ کی آواز بالکل صاف سُنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

''کون ہے حرام کا جنا —— بولتا کیوں نہیں ؟'' اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سُونت لی۔ اچانک کھیت کے پرلے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا اُبھرا اور جیسے مسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو۔

"میں ہوں ہوری کا کا ـــــــ بجُو کا!"اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ اُن کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی ـــــــ کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے ـــــــ وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ ـــــــ اِس کا اُن میں سے کسی کو اندازہ نہ ہُوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصہ سے کانپتی ہوئی آواز نہ سُنی اُنھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا ـــــــ

"تم۔۔۔ بجو کا۔۔۔ تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا ـــــــ بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر کی بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اُس پر اُسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پتلا میری فصل کاٹ رہا ہے؟"

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بجو کا بدستور اُن کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا ـــــــ جیسے اُس پر ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہُوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے اُنھوں نے دیکھا ـــــــ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے۔ اور بجو کا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی ـــــــ وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجو کا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا ـــــــ مگر آج۔۔۔ وہ آدمی لگ رہا تھا ـــــــ گوشت پوست کا اُن جیسا آدمی ـــــــ یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اُٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا ـــــــ مگر بجو کا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دُور جا گرا ـــــــ سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پہ ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــــ سب نے اُسے سہارا دیا۔ اور اُس نے خوفزدہ ہو کر بجو کا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو۔۔۔ تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجو کا! مجھ سے۔۔۔؟ جس نے تمہیں اپنے ہاتھوں

سے بنایا ــــ اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔"

بجوکا حسبِ معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا "تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا میں نے تو صرف اپنے حصّے کی فصل کاٹی ہے۔ایک چوتھائی ــــ"

"لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچّوں کا حصّہ لینے کا۔ تم کون ہوتے ہو؟"

"میرا حق ہے ہوری کاکا ــــ کیوں کہ میں ہوں ــــ اور میں نے اِس کھیت کی حفاظت کی ہے۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا۔اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ہوتا ــــ یہ تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی؟"

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو ــــ اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو ــــ؟"

"لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی ــــ؟ میں نے تو نہیں دی تھی!"

"یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی ــــ جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں انگریز شکاری کے پھٹے پُرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منہ بنایا تھا ــــ اسی دن اُن سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی ــــ اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی۔لیکن میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی ــــ میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو ــــ میں نے اپنا حصّہ کاٹ لیا، اس میں بگڑنے کی کیا بات۔" بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا ــــ تاکہ اُن سب کو اُسکی بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔یہ سب سازش ہے۔میں تمہیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلاوا ہے۔میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔تم درانتی پھینک دو۔میں تمہیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دُوں گا ــــ" ہوری چیخا، اور بجوکا نے مُسکراتے ہوئے درانتی

پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی —— پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہُوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور بجوکا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سُنانا تھا۔ مقدمہ کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دُور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہُوا دکھائی دیا —— سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہُوا آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہُوا، سب غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہُوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سُنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اُس نے پنچایت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کر لیا۔ اور پھر کھڑا ہو کر اپنے پوتوں سے کہنے لگا۔

"سُنو —— یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دُوری پر ہے —— میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا —— اگلے برس جب ہل چلیں گے —— بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا —— تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا —— بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا، جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا۔ اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بُھر بُھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں —— وہیں رہنے دینا —— تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا۔ —— کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا —— آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اُس کا وجود اُسے درانتی تھما دیتا ہے۔ اور اُس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے۔"

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اُس کے پوتے اور پوتیاں

آنس کے پیچھے تھے۔ اور پھر اس کی بہوئیں۔ اور اُن کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا۔ اُس کے پوتے پوتیوں نے اُسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا ـــــ اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے ـــــ بجو کا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اُتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

●●

سرکس

سرکس آنے کی خبر سے قصبے میں ایک چہل پہل سی پیدا ہوگئی تھی ــــ ہوسکتا ہے آپ کو لفظ قصبہ پر اعتراض ہو۔ کہ جہاں ریلوے اسٹیشن ہو جس سے ریل گاڑیاں مختلف اطراف جاتی اور آتی ہیں۔ کپڑے بُننے کا کارخانہ ہو، جس میں سینکڑوں مزدور کام کرتے ہیں۔ اسپات بنانے کی بھٹی ہو جس میں دن رات آگ دہکتی ہے اور پھر عدالتیں، پولیس تھانے۔ کالج، اسکول وغیرہ۔ وغیرہ سب کچھ ہو اُسے بھلا میں نے قصبہ کیوں کہہ دیا ـــ؟

بات دراصل یہ ہے کہ ہزاروں برس سے قصبہ میں رہتے، رہتے ذہن بالکل قصباتی ہوگیا ہے۔ اور یہ ساری ترقی جو دھیرے دھیرے ہماری زندگی میں بڑی خاموشی سے شامل ہوگئی ہے۔ اِس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کہ ایک طرف دو قدم بڑھتے محسوس ہوتے ہیں تو دوسری طرف رات کو کوئی بھیانک خواب دکھائی دے جاتا ہے کہ نیچے اور نیچے گِرے جا رہے ہیں۔ اپنا وزن کھو چکے ہیں۔ زمین میں کششِ ثقل باقی نہیں رہ گئی ہے۔ برف کے گالے سے ہو گئے ہیں گویا ـــــ ہاں تو لفظ قصبہ استعمال کرنے پر معذرت چاہتے ہوئے عرض ہے۔ کہ چہل پہل اور گہما گہمی کی فضا سی قائم ہوگئی تھی۔ اور وجہ تھی سرکس کی آمد۔

سرکس میں جانوروں کے کرتبوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ریاض کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات تو آپ کو اور ہم سب کو معلوم ہی ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ کشش کی وجہ وہ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جو مختصر ترین لباس میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اور اُنھیں عورتوں میں سے ایک عورت کا بڑا سا کٹ آوٹ قصبے،

معاف کیجئے گا۔ ۔ ۔ ۔ شہر کے چوراہے میں بنی ایک بلند عمارت پر لگا دیا گیا تھا۔

یہ واقعہ سرکس کی آمد سے پہلے کا ہے۔ جب گلی محلے کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کیے جا رہے تھے۔ جن میں سرکس کا نام درج تھا اور نام کے ساتھ لفظ گریٹ لگایا گیا تھا۔ سرکس کی خصوصیات اور اُن جانوروں کا ذکر تھا جو شاید پہلے اس طرح نہیں دکھائے گئے تھے۔ ایک توپ تھی جس کی نال میں سے بارُود کی بجائے ایک خوبصورت جسم والی عورت نکل کر فضا میں اُڑتی چلی جاتی تھی۔

مسئلہ یہ بھی زیرِ غور تھا کہ اِس توپ میں گولہ ڈالنے والی جگہ سے عورت داخل کی گئی ہوگی یا کوئی مصالحہ اِس قسم کا ڈالا گیا ہوگا جو عورت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اور مسئلہ وہ بڑا سا کٹ آوٹ بھی تھا۔ جس کا ذکر خاکسار نے اوپر کیا ہے ——— یعنی وہ عورت!

پلائی وُڈ کا دیو قامت کٹ آوٹ تھا۔ عورت کا جسم بڑا ہی گداز اور سڈول تھا۔ لباس انتہائی مختصر تھا۔ جتنا بھی لباس بینیٹر صاحب نے بنایا تھا اس پر چمکی لگا کر جگمگا دیا تھا کہ دھوپ میں آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ عورت کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ہنٹر تھا اور قریب ہی ایک ببر شیر دُبکا بیٹھا تھا۔

اب ایسا کون ہوگا، جس کے سینے میں دِل بھی دھڑکتا ہو۔ اُسے چوراہے سے گزرنے کا اِتفاق بھی ہوا اور وہ اِک ذرا اُس عورت پر نظر نہ ڈال لے۔ مقصد یہ کہ بہت ہی خوبصورت عورت بنائی تھی بینیٹر صاحب نے ——— اور شیر ببر کے بارے میں ایک صاحب کا ریمارک قابلِ غور و ستائش ہے۔

"کتّا بنا کے بٹھا رکھا ہے سالے کو۔"

اب ایک راز کی بات بھی سن لیجئے ——— کہ یہی عورت سرکس کی مالک تھی۔ چوراہے والے بنواری بنواڑی کی دُکان پر شام جو محفل جمتی تھی اُس میں اِس بات کا چرچا تھا۔ کہ پہلے اس گریٹ سرکس کا مالک اِس عورت کا باپ تھا۔ اُس نے یہ سب جانور اور کلا باز ایک، ایک کر کے اکٹھا کئے تھے۔ کہتے ہیں، خود بھی اچھا کلا باز تھا۔ وہ اِس

سرکس کو لے کر ملکوں، ملکوں گھومتا تھا اور جہاں جو بھی جانور اور کلاباز نظر آیا اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔ کچھ عرصہ ہُوا ایک جانور کو سدھانے کے دوران حادثہ میں اُسکی موت واقع ہوگئی۔ اور سرکس کا سمبل ــــ یعنی کہ یہ لمبا شاندار ہنٹر اسکی بیٹی نے سنبھال لیا۔ ویسے ہی جیسے کہ کسی وزارت کا بوجھ اٹھانے کو قلمدان سنبھالنا کہتے ہیں۔

بنواری پنواڑی کی دُکان دُنیا بھر کے مسائل، سیاست اور نیک و بد پر گفتگو کرنے کا ایک سپاٹ ہے ــــ جی ــــ؟ سپاٹ! جی ہاں میں نے یہ لفظ دھبہ کے معنیٰ میں نہیں بلکہ مرکز کے معنی میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرکز مجھے کچھ مناسب نہیں لگا۔ کیونکہ سپاٹ میں جو وسعت ہے وہ مرکز کے حدُود میں بند ہونے کو تیار نہیں ــــ خیر صاحب ہمیں تو سرکس اور سرکس کی اُس شاندار مالکن اور ریاض کے زیور سے آراستہ اُسکے کلابازوں اور جانوروں کے بارے میں گفتگو کرنا تھی۔ یہ بیچ میں مقامی کالج کے فلاں خاں صاحب کہاں سے آگئے جو لفظ، لفظوں اور الفاظ الفاظوں سے سر کھپایا کرتے ہیں۔ بھئی آ بھی سکتے ہیں کہ اس قصبہ میں کالج بھی موجود ہیں۔ اور ان میں اساتذہ بھی ہیں جو اپنے فالتو وقت میں بچوں کو پڑھا بھی دیتے ہیں ــــ ویسے انکا سارا وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر صاحب میں قبول کرتا ہوں کہ بہک گیا تھا۔ اور معذرت چاہتا ہوں۔ ذِکر ہو رہا تھا ہنٹر والی دلکش عورت کا جو اس گریٹ سَرکس کی مالکن تھی اور سرکس قصبہ میں آنے والی تھی۔ جس کا چرچا زبان زدِ خاص و عام تھا ــــ کہ اب گویا چند دِن تفریح رہے گی۔ اور بنواری پنواڑی کی دکان کے سامنے گفتگو کا سپاٹ تھا۔ اور سب سے اہم بات جو اِن دنوں چل رہی تھی وہ یہ کہ آدمی تو خیر ذہن رکھتا ہے۔ اشارے پر کرتب دِکھا سکتا ہے سِکھانے سے سیکھ سکتا ہے۔ کہ سن سکتا ہے۔ دیکھ سکتا ہے اور اسکے ردِّ عمل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ لیکن اِن جانوروں کو سِدھانا سکھانا اور ان سے کمالات کروالینا کیسے ممکن ہے؟ اس کے پیچھے کون سا فن اور راز چھپا ہُوا ہے؟ مثال کے طور ملاحظہ ہو سامنے اس اونچی عمارت پر لگے بینر کے کٹ آوٹ میں بھیگی بلی بنا ببر شیر ــــ!

جہاں بنارسی اور دیسی پان کے پتوں پر ایک سو بیس، تین سو، کشمیری قوام اور بابا چھاپ کے ساتھ، ساتھ کچا اور سینکا ہُوا چھالیا چلتا رہتا وہاں یہ بات چیت بھی چلتی رہتی۔ کہ کمال ہے بھائی ـــــ آدمی جو کچھ نہ کرے کم ہے ـــــ اور سائنس نے جس قدر بھی ترقّی کی ہے وہ سب آدمی کی حاصل کردہ ہے۔ اور جانور کو جنگل سے پکڑ کر سدھا کر، پنڈال میں ہزاروں لوگوں کے سامنے کرتب کرنے پر مجبور کرنا بھی آدمی ہی کا کارنامہ ہے۔

لیکن نہ جانے کیوں میری تسلّی نہیں ہو پا رہی تھی۔ معاف کیجئے گا۔ اب جو بیانیہ ہیں۔ مَیں وارد ہُوا ہوں تو آپ چاہیں گے کہ معلوم تو ہو کہ بھلا مَیں ہوں کون ہ؟ سب معمّے حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ معمّہ حل نہیں ہو سکتا ـــــ کیوں کہ اپنا تعارف کروانے والے کو پہلے خود تو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کون ہے۔ اور ہمارے پاس اپنے بارے میں جو معلومات موجود ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر ہم فوراً ہی ہاتھ آگے بڑھا کر کہہ دیتے ہیں کہ خاکسار کو فلاں، فلاں اور فلاں کہتے ہیں۔ تو ہم یہ سب لوگوں کے کہے سُننے کی بنا پر کہہ دیتے ہیں ورنہ ہمیں خود اپنے بارے میں زندگی بھر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہم کون ہیں۔؟ لہذا ـــــ چونکہ میں اپنے بارے میں بذاتِ خود کچھ نہیں جانتا اس لئے آپ یہی سمجھیں کہ غیب سے ایک آواز آرہی ہے جو الفاظ میں ڈھل جاتی ہے اور اس کے پیچھے جو نظر نہ آنے والی شخصیت ہے نا وہ کچھ بھی نہیں، ایک وہم محض ہے۔ اور خود تشکیک کی بیماری میں مبتلا ہے ـــــ اور آپ کو ایک بیمار آدمی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ ایک صحت مند، توانا سماج کی تشکیل میں مصروف ہیں ـــــ اور بنیر والے کٹ آوٹ میں بنی دلکش اور شاندار عورت کے ہاتھ میں لمبا ہنٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ببر شیر دُبکا بیٹھا ہے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ اتنا طاقتور، نڈر اور خوفناک جانور آدمی کے اشاروں پر کرتب دکھانے کے لیے کیونکر رضا مند ہو جاتا ہے؟

ایک صاحب نے خیال آرائی کی "یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے ـــــ تفریح

کیلئے آدمی کو آدمی سے لڑوانا، آدمی کو جنگلی درندے سے لڑوانا یا پھر ایک درندے کو دوسرے درندے سے لڑوانا۔"

دوسرے نے کہا۔" بھئی وہ تو ٹھیک ہے کہ یہ سب آدمی اپنی تفریح کے لئے کرتا ہے۔ لیکن آدمی اور درندہ اِس کے لیئے تیار کیونکر ہو جاتا ہے ـــــ؟"

لوگوں نے بنواری بنواڑی سے پان لیکر منھ میں رکھے۔ اور اصل سوال کا صحیح جواب دیے یا پائے بِنا ہی اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

ایک روز سرکس اپنے پورے تام جھام کے ساتھ قصبے میں آپہنچا ـــــ قصبے کی خستہ پرانی فصیل کے باہر جو بڑا سا میدان تھا۔ اسمیں کشادہ پنڈال لگ گیا ـــــ اور ایک طرف کئی چھوٹے، چھوٹے خیمے ایستادہ کر دیئے گئے جن میں جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے رہنے لگے ـــــ اور دوسری طرف پنجروں کی قطاریں کھڑی کر دی گئیں جن میں جانور اور درندے بےچینی سے ٹہلتے نظر آتے ـــــ یہ بے چینی کیوں تھی۔ شاید وہ اپنے پنجروں سے باہر نکل کر اپنے کرتب دِکھانے کیلئے بے چین ہو رہے تھے۔ یا پھر . . . . ؟ نہیں بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ بس ـــــ کلاکاروں اور کلابازوں، آرٹسٹوں اور انتظامیہ کے لوگوں کیلئے قصبے کی سرکاری سرائے اور پنچایتی دھرم شالہ بک کر دالی گئی تھی۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں سے پوسٹر اُٹھائے ہوئے سرکس کے ملازمین گزرتے اور منادی والا تماشے کے اوقات کا اعلان کرتا۔ اس جلوس کے ساتھ سرکس کے کئی جانور بھی ہوتے اور ایک جوکر بھی ـــــ جانور جوکر کے اشارے پر لوگوں کو سلام کرتے گویا اُنھیں اپنے کمالات دیکھنے کیلئے آنے کی درخواست کر رہے ہوں ـــــ سرکس کی مالکن کی طرف سے سرکس میں کام کرنے والی عورتوں کو شہر میں نکلنے کی ممانعت تھی لیکن مرد کلاکار اپنے روزمرّہ استعمال میں آنے والی چیزوں کی خرید و فروخت کیلئے بازاروں میں نظر آنے لگے۔ شہر کے بچّے خاص طور پر انھیں یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کسی دوسرے سیّارے کی مخلوق ہوں۔ ایک بھیڑ اُن کے گرد جمع ہو جاتی اور پھر وہ جدھر جاتے

وہ بھیڑ ان کے پیچھے کھنچی چلی جاتی ـــــ کتنی عجیب بات تھی کہ ایک معمولی سا فرق فن یا اختیار ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے ممیّز یا افضل بنا دیتا ہے۔

اس روز پہلا تماشہ تھا ـــــ اس کی رسمِ افتتاح معمول کے مطابق شہر کے سب سے اعلیٰ افسر کے ہاتھوں ہوئی ـــــ خاکسار بھی وہ کھیل دیکھنے گیا۔

میں تمام آئٹمز کی تفصیل بیان کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ کہ اس شو میں وہ سب کچھ ہُوا جو ہر سرکس کے شو میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے تصوّر کی آنکھ سے نیم برہنہ عورتوں کو جھولا جھولتے ـــــ اور تنی ہوئی تار پر سائیکل چلاتے دیکھ سکتے ہیں۔ مرد کلاکاروں کو ہر کھیل میں اُن کا ساتھ دیتے بھی دیکھ سکتے ہیں ـــــ توازن کے مختلف کمالات تصوّر کرنا بھی مشکل نہیں۔ جانوروں کا مالکن کے چابک کی شڑاپ، شڑاپ کی آواز پر ہر حکم کی تعمیل کرنا بھی سوچ سکتے ہیں وغیرہ ـــ وغیرہ۔ لیکن اِس خاکسار کو جو آئیٹم بہت ہی اَدبھُت لگی ـــــ وہ تھی تمام جانوروں اور انسان کلابازوں کا ایک بڑی سی میز کے گرد بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھانے کا منظر۔ اب ذرا آپ اپنے تصوّر کی آنکھ کو چند لمحہ کے لیے اِس منظر پر مرکوز رکھیں تو پھر مَیں آپ کو وہ بات بتانے جا رہا ہوں جس نے سب کو حیران و پریشان کر رکھا تھا۔ یعنی یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ اور اب اُس حیران کرنے والی بات کا جواب اس خاکسار کو مِل چُکا تھا۔

لیکن اس سے پیشتر کہ خاکسار وہ بات آپ کے گوشِ گزار کرے چند باتیں آپ ذہن نشین کر لیں۔ کہ سرکس کی مالکن اصل میں پینٹر صاحب کے بنائے ہوئے کٹ آوٹ سے زیادہ پُرکشش شاندار اور خوبصورت تھی۔ اور کہ اس کے دو بیٹے تھے دونوں اعلیٰ درجہ کے کلاباز تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک بیٹا کرتب دکھانے کے دَوران ایک حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ گویا اس کا حشر بھی کچھ مالکن کے باپ جیسا ہی ہُوا تھا ـــــ دوسرا بیٹا جوکر تھا اور ہر کرتب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اِس طرح کہ تماشائی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جائیں۔ ایک بات سب سے اہم یہ

تھی کہ اس سرکس میں ایک اپاہج کلاباز تھا جو جمناسٹک میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ شکل وصورت سے اچھّا تھا ——— ٹانگیں فالج زدہ تھیں۔ لیکن بازوؤں میں بلا کی قوت تھی۔ وہ لکڑی کے گھوڑے پر دونوں بازوؤں اور کبھی ایک بازو سے اپنے جسم کو مختلف زاویوں پر لیجانے، جھولنے اور قلابازیاں کھانے کے شاندار کھیل دکھاتا تھا۔ (مقامی کالج کے فلاں صاحب سے معذرت چاہتا ہوں کہ اس سے پیشتر کلا باز کُتّے والے ک سے لکھا ہے اور اس بار قینچی والے ق سے قلابازی لکھا ہے) ——— یا پھر پنڈال کی چھت سے لٹکتے ہوئے دو رنگز کو پکڑ کر اپنے جسم کو عجیب وغریب توازنی زاویوں پر لے جاتا تھا ———

اَب یہ اتفاق ہی سمجھیے کہ وہ دوسرے آرٹسٹوں کے ساتھ اُسی سرائے میں قیام پذیر تھا۔ جس میں خاکسار کئی صدیوں سے رہ رہا تھا۔ صبح سویرے غسل خانہ استعمال کرنے کے سلسلے میں خاکسار کی اُس سے تُو، تُو۔ مَیں، مَیں ہوگئی۔ اور پھر یہ تُو، تُو۔ مَیں، مَیں تُو ہی تُو اور مَیں ہی مَیں کے عمل سے گزرتی ہوئی دوستی میں بدل گئی۔ وہ اچھا دوست، اچھّا انسان اور اچھا رہبر ثابت ہُوا۔

ہمارا کھانا پینا ایک ساتھ ہوگیا ——— اُس نے اپنے ماضی کو کرید کر اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتایا جو اُسے اُس کے بارے میں دوسروں نے بتایا تھا۔ کہ اس کا باپ پہلوان تھا۔ ایک شرط ہارنے کی وجہ سے خودکشی کر کے مرگیا۔ ماں نے اسے ہسپتال میں جنم دیا اور راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔ نرسوں اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی وجہ سے اسکی ٹانگیں فالج سے ناکارہ ہوگئیں اور اس نے اپنی زندگی خود شروع کی اور جمناسٹک سیکھ کر اس سرکس میں شامل ہوگیا ——— مگر میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا جو بتاتا ——— لہٰذا اپنی خاکساری کا اظہار کر کے شرم سے سر جھکا لیا۔

اُسی کی وجہ سے مَیں نے دِن کے وقت سرکس کے تمام پنجروں کا طواف کیا۔ مختلف آرٹسٹوں سے متعارف ہُوا اور چند حسین عورتوں سے گفتگو کا لطف بھی لیا اور ایک بار سرکس کی شاندار اور پرکشش مالکن اور اس کے جوکر بیٹے سے ملاقات

کا شرف بھی حاصل ہُوا۔

اور پھر موقع پا کر مَیں نے پوچھ ہی لیا — کہ یہ **معجزہ کیا ہے کہ آدمی اور جانور اور درندے اشاروں پر قلا بازیاں کھانا قبول کر لیتے ہیں؟**

میرا یہ پوچھنا تھا کہ اُسکی **عجیب کیفیت ہوگئی۔ جیسے اُس کے** اوپر کے دھڑ کو بھی فالج مار گیا ہو۔ اسکا رنگ **فق ہوگیا۔ آنکھیں بے چینی سے** تڑپنے لگیں اور چہرے پر ایک عجیب سا کرب چھا گیا — **وہ دیر تک خاموش** رہا اور میری طرف آنکھیں جھپکے بنا دیکھتا رہا — میں بھی قدرے **پریشان و نادم سا ہُوا۔** کہ ایسی بات کیا پوچھ لی کہ جو مُناسب نہ تھی۔؟

"کیا بات ہے آپ نے **میری بات کا جواب نہیں** دیا سینڈو صاحب؟" (اسے سینڈو صاحب کے نام ہی سے **پکارا جاتا تھا)** میں نے ہمّت کر کے اور اپنی خفّت مِٹانے کے لیے کہا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی اور کہنے لگا — "لیکن یہ بات **پوچھنے کی** آپ کو ضرورت کیوں آن پڑی مسٹر **خاکسار — ؟**"

"دراصل بات یہ ہے کہ یہ صِرف **میرا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اِس سارے قصبے کے** ذی ہوش لوگوں کا مسئلہ ہے۔ سبھی اِس **بات کا جواب چاہتے ہیں۔**" میں نے جواب دیا۔

"دیکھیئے۔" اس نے کہا اور پھر رُک گیا۔ مَیں اُس کے دوبارہ گویا ہونے کا منتظر رہا۔ کافی دیر کے بعد اس نے کہا — "یہ بات اتنی دیر تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک سرکس کے پورے سیٹ آپ کو نہ سمجھیں — درمیان میں ایک بہت بڑا رنگ ہوتا ہے۔ جِس کے گِرد کرسیوں اور بنچوں پر تماشائی بیٹھے رہتے ہیں۔ جن کی نظریں کرتب دِکھانے والوں پر جمی رہتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک کیبن بنایا جاتا ہے جسمیں آرکسٹرا ہوتا ہے۔ عام طور پر اس میں فوج سے ریٹائر ہونے والے سازندے کام کرتے ہیں۔ ہر کھیل کے ساتھ الگ دُھن بجتی ہے۔ ہر کرتب کرنے

والے کے ساتھ تین چار جوکر بھی ایرینا میں داخل ہوتے ہیں جو عام طور پر مالکن کے خاص آدمی ہوتے ہیں۔ زرق برق لباس دیکھ کر اور چہروں پر موٹے میک اَپ کی تہ سے آرٹسٹ کے اصلی حُسن کا اندازہ لگانا بالکل مشکل ہے ـــــ اور پھر مالکن کے ہنٹر کی شڑاپ، شڑاپ کی آواز۔ ۔ ۔ ۔ جو ہر کھیل میں موجود رہتی ہے اور ہر آرٹسٹ کو ملنے والی داد خُود سر جھکا، جھکا کر مُسکراتے ہوئے قبول کرتی ہے۔ ـــ اَچھّا اَب اُس منظر پر آتے ہیں ـــــ جس میں ایک بڑی میز کے گرد ـــــ شیر، بکری، آدمی، بندر، کتا، گھوڑا اور ہاتھی اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اور یہیں آپ کی بات کا جواب پوشیدہ ہے۔ جو بڑی معمولی سی بات ہے۔ ہر اس بڑی بات کی طرح جو معلوم ہو جانے کے بعد معمولی نظر آنے لگتی ہے اور وہ بات یہ ہے۔ جیسے ہر مالک جانتا ہے۔ کہ اگر آدمیوں، عورتوں، جانوروں اور درندوں سے کام لینا ہے تو انھیں آدھے پیٹ کھانا دینا چاہیئے اور باقی آدھے پیٹ کھانے کا وعدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

سَرکس ہمارے شہر معاف کیجئے گا ہمارے قصبے سے اگلے قصبے میں جا چکی ہے۔ سینڈو صاحب بھی جا چکے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں سے اس گہما گہمی اور چہل پہل کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ چوراہے کی بلند عمارت پر لگا ہُوا سَرکس کی ہنٹر والی مالکن کا کٹ آوٹ اُتارا جا چکا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں۔ جب کبھی میں بنواری پنواڑی کی دکان سے ایک سو بیس کا بنارسی پان کھا کر سرائے کی طرف جا رہا ہوتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں شڑاپ شڑاپ کی آواز گونجنے لگتی ہے ـــــ اور میں خوف زدہ سا ہو جاتا ہوں۔

پس اذاں ـــــ

کئی دن بعد، آج میں پھر بنواری پنواڑی کی دکان پر کھڑا پان لے رہا ہوں۔ اور سامنے والی:۔ بڑی عمارت کی اس خالی دیوار کو دیکھتا ہوں جس پر کبھی سرکس کی مالکن کا کٹ آوٹ آویزاں تھا۔
اُسکے ہنٹر کی شڑاپ شڑاپ کی آواز میرے ذہن کے کسی کونے میں سے اُبھرتی ہے۔

لیکن آج مجھے اُس آواز سے پہلے جیسا خوف محسوس نہیں ہُوا۔
ایکاایکی میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہُوا ہے۔ کہ میری طرح اگر سرکس کے تمام
انسانوں اور جانوروں کے ذہن سے بھی ہنٹر کی آواز کا خوف جاتا رہا تو پھر کیا ہوگا؟

ساحل پر لیٹی ہوئی عورت

شکاری مرگول آنکھوں سے اندھا تھا۔

اسکے اندھا ہونے کے پیچھے بھی ایک پُراسرار داستان تھی۔ ہُوا یوں کہ ابھی یہ نگر آباد ہی ہو رہا تھا جس میں وہ رہتا ہے کہ وہ ایک تیز رفتار ہرن کے پیچھے بھاگتا ہُوا یہاں تک پہنچا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور ہرن یہاں پہنچ کر پہاڑی کے نیچے اوجھل ہو گیا ـــــ وہ سرحد تھی اور اس سے آگے جانے کا قانوناً حکم نہ تھا ـــــ اور قانون صرف انسان کے لیے ہے جو مہذب ہے، پڑھا لکھا ہے، اپنا اور سماج کا اچھا بُرا سمجھ سکتا ہے۔ اس چوکڑیاں بھرتے ہرن کے لیے نہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں بغیر ضروری کاغذات کے داخل ہو جاتا ہے۔

لہذا مرگول وہاں رُک گیا۔ اُس نے پہاڑ کے دامن میں ایستادہ ایک تختی دیکھی جس پر لکھا تھا "بغیر اجازت نامہ کے آگے بڑھنا قانوناً منع ہے" ـــــ اور یہ قانون دونوں ملکوں کے حکام کی مرضی سے بنا تھا ـــــ

مرگول کو اپنی شکست کا بڑی شدّت سے احساس ہُوا۔ بے بسی پر افسوس ہُوا اور انسان ہونے پر ندامت ہوئی ـــــ گہری سانس لیتا ہُوا، داہنے ہاتھ میں وزنی بندوق تھامے کیچڑ سے لت پت اپنے شکاری بوٹوں کو دیکھنے لگا اور اُس کے جسم سے پسینہ یوں پھوٹ پڑا جیسے چشمے سے پانی اُبل پڑتا ہے۔ اُسنے اپنے اردگرد نظریں گھما کر دیکھا۔ دائیں طرف ایک اونچی سرمئی پتھروں والی پہاڑی تھی جس پر ہری بھری بُوٹیاں اُگی تھیں ـــــ سامنے دُور، دُور تک سبز میدان پھیلا تھا جسمیں اونچے گھنے درخت جھوم رہے تھے بائیں جانب وسیع گہرا سمندر تھا جس کا پانی دیوانوں کی طرح ساحل سے سر ٹکرا رہا تھا۔ اور

پیچھے وہ جنگل تھا جسے وہ پھلانگ کر آیا تھا ــــــ اور اس سارے ماحول میں نیلے آسمان کے تلے ایک نیا نگر تعمیر ہو رہا تھا جسمیں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کی جا رہی تھیں۔ فصیل ابھی آدمی کے قد تک ہی اونچی ہوئی تھی اور نگر کا بڑا دوار کھڑا کیا جا رہا تھا۔

اسنے دیکھا کہ سب اچھا ہے اور اس نے وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اور وہیں رہنے لگا ــــ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اس دُنیا کا ایک حصّہ بن گیا اور نگر کے دوسرے لوگ اُسے جاننے لگے اور وہ اُن سے واقف ہو گیا ــــ لہٰذا وہ سورج نکلتے ہی نگر دوار سے باہر نکلتا اور اپنی بندوق کے بل بوتے پر شکار کر کے شام کو واپس لوٹ آتا۔

ایک شام جب وہ کچھ خرگوش مار کر لوٹ رہا تھا۔ اُسنے ایک بڑا ہی عجیب منظر دیکھا۔ کہ ایک سیاہ فام الف ننگی عورت سمندر ریں سے نکلی اور ساحل کی ریت پر اپنے پاؤں کے نشان چھوڑتی ہوئی پہاڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ عورت کا جسم بلا کا پرکشش تھا۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اُسکے جسم کا انگ، انگ چمک رہا تھا مرگول کے ذہن میں اُتھل پتھل سی ہوئی اور اچانک اس نے دیکھا کہ مرے ہوئے خرگوشوں میں سے ایک خرگوش نے آنکھیں کھولیں، ایک انگڑائی لی اور پھر اُسکی رسی کا حلقہ کھول کر یہ جا، وہ جا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

مرگول اچھا شکاری تھا۔ مگر قدرت بھی بڑی ستم ظریف چیز ہے ــــ کہ آدمی کو سب کچھ نہیں دیتی ــــ لہٰذا مرگول قوّتِ مردمی سے محروم تھا ــــ لیکن خرگوش کی اِس حرکت نے اُسکے جسم میں ایک عجیب طرح کی جھُرجھُری پیدا کی اور وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اُس احساس سے دوچار ہُوا ہے جس سے زندگی بھر اُسکا سابقہ نہیں پڑا تھا ــــ وہ خوش ہُوا اور دیوانہ وار اُس عورت کے پیچھے بھاگا ــــ عورت بلا کی تیز رفتاری سے چلنے لگی وہ ہانپتا ہُوا اُسکے پیچھے جا رہا تھا۔ سورج پہاڑ کے پیچھے غروب ہو گیا اور سارے میں دھندلکا پھیل گیا اور اُس دھندلکے میں وہ عورت پہاڑ کی ایک کھوہ میں داخل ہوئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ لپک کر کھوہ کے دہانے تک پہنچا اور اسنے دیکھا اندر گہری تاریکی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ اُس نے پکارا۔

" اے عورت تُو کہاں ہے ـــــ ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو ہماری زندگی کیلئے لازم ہو گئی ہے ـــــ "

" اے شکاری مرگول اندر مت آنا۔ کھوہ کے دہانے سے آگے کی زمین تم پر آگ برسائے گی اور تُو اپنے اندر کے جذبے اور باہر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا ـــــ اگر تو مجھے پانا چاہتا ہے تو برس ہا برس تک تجھے تگ ودو کرنا ہو گی اور پھر کہیں جاکر تو وصل کی مسرت پائے گا۔" کھوہ کے اندر سے سیاہ فام عورت کی مترنم آواز سنائی دی۔ جو اُسکی جسمانی کشش سے بھی زیادہ پر کشش تھی۔

مرگول کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق تڑپ اٹھی۔ اُسکا جسم مارے غصّہ کے کانپ اٹھا اور اس نے زمین پر سے پتھّر اٹھایا اور کھوہ کے اندر دے مارا اور غصّہ میں چیخا۔

" میں مرد ہوں اور یہ میرا شیوہ نہیں۔ تم نے اگر اپنے آپ کو میرے حوالے نہ کیا تو مجبوراً مجھے اپنی بندوق سے کام لینا ہو گا۔"

اندر سے ایک کراہ سنائی دی۔ اور پھر ایک غضب ناک آواز۔ " تم نے مجھ کو پتھّر سے مارا ـــــ اب تم پر لازم ہے کہ ہر روز اسی وقت مجھ پر آکر پتھر کی ضرب لگاؤ۔ اور اگر تم نے اپنے معمول میں ناغہ کیا تو میرا قہر تم پر نازل ہو گا۔ اور تو زندہ نہ بچے گا۔ اس کے بعد آسمان پر بجلی چمکی اور بادل گرجے اور سب طرف تاریکی پھیل گئی ـــــ اور مرگول خوف زدہ ہو گیا۔ اُسکے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق اور کندھے سے لٹکتے ہوئے مردہ خرگوش بارش میں بھیگ گئے اور وہ ٹھٹھرتا ہُوا وہاں سے چلا اور اپنے گھر پہنچ کر دَم لیا۔

اگلی صبح مرگول پورا مرد تھا ـــــ اور اُسکے بعد اُسنے یکے بعد دیگرے کئی عورتوں سے اپنے تعلقات قائم کئے اور زندگی کی بے پناہ مسرت سے ہم کنار ہُوا وہ بہت خوش تھا۔ کہ اب وہ جانور کی آہٹ اور پرندے کی آواز پر گولی مار کر اُسے ڈھیر کر سکتا تھا۔ شام کو جب وہ جنگل سے شکار کر کے واپس لوٹتا تو معمول کے مطابق

بلاناغہ کھوہ کے دہانے پر کھڑا ہو کر زمین پر سے ایک پتھر اُٹھاتا اور پھر اُسے کھوہ کے اندر دے مارتا۔ تب اندھیرے میں سے عورت کے دبے، دبے قہقہہ کی آواز سنائی دیتی اور وہ خوفزدہ سا اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتا ـــــ شہر تب تک پوری طرح آباد ہو چکا تھا۔

یہ معمول کئی برسوں تک چلتا رہا ـــــ کہ ایک دِن سورج نہ نکلا۔ سب طرف کُہرہ چھایا ہُوا تھا۔ گہری دُھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ مرگوں کے بستر پر شہر کی خوبصورت ترین عورت شب باشی کیلئے موجود تھی جو ابھی بیدار نہ ہوئی تھی کہ اُسکا جسم گہرے سُکھ میں ڈوبا ہُوا تھا۔

مرگوں نے اُسکے خوبصورت، سڈول، چکنے جسم پر اپنے ہاتھ پھرائے وہ کسمسا کر ذرا سا مُسکرائی اور بدستور سوتی رہی ـــــ مرگوں نے سوچا آج وہ شکار پر نہیں جائے گا کہ جانور اور پرندے سب اپنی اپنی رہائش گاہوں میں دُبکے پڑے ہونگے۔ اسنے عورت کے گرم، گرم جسم سے اپنے آپ کو لپیٹ لیا اور سَر اُسکی چھاتیوں میں دے کر پھر سو گیا ـــــ اور بے خبر ہو گیا ـــــ شام ہونے سے پہلے، پہلے بارش بھی شروع ہو گئی۔

اگلے دن جب مرگوں شکار کو جانے لگا تو اُس نے اُس کھوہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ الف ننگی سیاہ فام عورت دہانے پر کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ غضب ناک تھا۔ اور ٹکٹکی باندھے مرگوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مرگوں غیر ارادی طور پر، جیسے کسی جادُو نے اُسے جکڑ رکھا ہو، آہستہ، آہستہ کھوہ کی طرف بڑھنے لگا ـــــ اور پھر عورت کے بالکل مقابل کھڑا تھا۔ اس میں بولنے تک کی طاقت نہ تھی۔

"تم نے کل اپنے معمول کو توڑ دیا شکاری مرگوں ـــــ تم نے کل جو پتھّر مجھ پر نہ مارا اُس پتھر کا کیا ہُوا ـــــ؟ اور میرے جسم کا وہ حصّہ جس پر کل چوٹ نہ پڑی اُسکا کیا ہو گا ـــــ؟ میں نے تمہارے جسم کو جو طاقت دی وہ قدرت نے تمہیں عطا نہیں کی تھی۔ شرط تھی کہ تم بلا ناغہ مجھ پر پتھّر برساؤ گے۔ تم نے وعدہ خلافی کی۔

لہذا سزا کیلئے تیار ہو جاؤ ـــــ یہ لمحے جو تم گزار رہے ہو، یہ سانسیں جو تم لے رہے ہو۔ تمہاری زندگی کی آخری سانسیں ہیں ـــــ" عورت نے اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور مرگول نے دیکھا کھوہ میں سے نکل کر ایک سیاہ ناگ، عورت کے اشارے کا منتظر ہے۔ موت مرگول کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

" رحم ـــــ رحم ـــــ اے عورت۔ کہ کل گہری دُھند تھی اور اس وقت شدید بارش۔ جب مجھے یہاں تمہاری پرستش کیلئے آنا تھا ـــــ میں آج دو پتھر تم کو ملادوں گا۔" مرگول گڑگڑایا۔

پتھر تو دو چھوڑ چار بھی مارے جا سکتے ہیں لیکن وہ لمحہ جو اُس پتھر کے مقدر کے ساتھ وابستہ تھا ـــــ واپس نہیں آسکتا ـــــ بہر حال سزا تو تمہیں بھگتنا پڑے گی۔" عورت نے جواب دیا اور کالا ناگ آہستہ، آہستہ مرگول کی طرف بڑھنے لگا۔

" نہیں ـــــ ۔۔۔! " مرگول چیخا ـــــ " میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

" تو پھر زندگی کے برابر عزیز چیز تمہیں دینا ہوگی۔" عورت نے کہا۔

" وہ کیا ہو سکتی ہے۔؟ " سانپ بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اور پلٹ کر عورت کی طرف دیکھنے لگا ـــــ

" قوتِ مردمی یا بینائی ـــــ!" عورت بڑی مدھم اور ملائم آواز میں بولی۔

مرگول نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور پھر کہا ـــــ " بینائی۔"

عورت نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی آسمان کی طرف اٹھادی ـــــ

کالا ناگ اُچھلا اور دوسرے ہی لمحے اُسکے ہونٹ مرگول کی کنپٹی سے چپک چکے تھے۔ ایک شدید درد کا احساس ہُوا اور پھر اُس کے بعد جیسے اُسکے خون میں انگارے بھر دیئے گئے ہوں۔ اور پھر یکدم سب طرف تاریکی پھیل گئی ـــــ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا ـــــ نہ عورت، نہ سانپ، نہ پہاڑ، نہ سمندر، اور نہ جنگل ـــــ مرگول سسک، سسک کر رو رہا تھا۔

شکاری مرگول آنکھوں سے اندھا تھا ــــــ مگر وہ جانوروں کی آہٹ اور پرندے کی آواز کی سیدھ میں گولی مارتا تھا اور اُسکا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا ــــــ اور وہ قوتِ مردمی سے مالا مال بھی تھا۔

ایک شام وہ شکار سے لوٹ رہا تھا۔ کہ مقرّرہ وقت پر کھوہ کے دہانے پر پہنچ کر رُکا۔ حسبِ معمول اس نے زمین پر سے ایک پتھر اُٹھایا اور اندازے سے کھوہ میں دے مارا۔ خلافِ معمول اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ نہ ہلکے، ہلکے قہقہے کی اور نہ ہی کراہ کی۔ وہ بہت حیران ہُوا۔ اتنے برسوں میں آج پہلی بار کھوہ میں سناٹا تھا۔ وہ بے اختیار پُکار اٹھا۔

"اے عورت تو کہاں ہے۔؟ میں نے اپنا معمول پورا کیا۔ لیکن تمہاری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ کیا اجازت ہے کہ میں اپنا شکار لے کر اپنے گھر چلا جاؤں؟"

لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ وہ پہاڑی کی طرف سے سمندر کی طرف مڑا اور نگردوار کی طرف بڑھنے لگا ــــــ اسکے شکاری بوٹوں کے نیچے ساحل کی ریت دَب، دَب جاتی تھی۔ وہ حیرانی اور خوف ملے جذبات میں ڈوبا ہُوا۔ آہستہ، آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ اندازے کے مطابق صحیح سمت میں جا رہا تھا کہ اچانک کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ بڑی مشکل سے اپنا توازن قائم رکھ سکا۔ اور پھر ذرا ہٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اِس بار گِر ہی گیا۔ اس کے ہاتھ جس چیز پر پڑے وہ ایک سرد جسم تھا۔ جو بالکل اکڑ چکا تھا۔ اُسنے ٹٹول، ٹٹول کر دیکھنا شروع کیا۔ سَر سے چہرہ ــــ چہرہ سے گردن ــــ گردن سے سینہ ــــ سینہ اُبھرا ہُوا سخت کسی عورت کا پھر پیٹ اور پیٹ کے عین وسط میں ناف کی گہرائی ــــ اور اس کے نیچے بال ــــ اور بالوں کے جنگل میں ...... وہ ڈر سا گیا۔

لیکن اس نے اپنے ہاتھ سڈول رانوں پر پھسلاتے ہوئے نازک پاؤں کی اکڑی ہوئی انگلیاں پکڑ لیں۔

"کون ہے یہ ــــ؟" اُسنے بھسمسا کر اپنے آپ سے پوچھا، "کہیں... کہیں..!"

اور پھر جیسے ہی اسکے ذہن میں وہ خیال بجلی کی طرح کوندا ـــــ اسکے مونہہ سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی۔ اور اسے اچانک احساس ہُوا کہ وہ قوتِ مردمی سے ایکا ایکی محروم ہو گیا ہے۔ وہ گھگھیا کر اُٹھا اور اپنا شکار وہیں چھوڑ کر نگر کی طرف بھاگا ـــــ آج اُسکی بندوق اُسے بہت وزنی لگ رہی تھی۔

نگر کی سرائے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اُسکا دل اِس سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا ـــــ وہ اپنے مکان میں داخل ہُوا، بندوق اُسنے ایک طرف پھینکی اور بغیر کپڑے اور جوتے اُتارے بستر پر دھم سے گرا۔

صبح سارے نگر میں یہ خبر گرم تھی کہ کل رات ایک اجنبی سفید گھوڑے پر سوار نگر کی سرائے میں اترا ـــــ اسنے گھوڑا کھونٹے سے باندھا اور اسکے سامنے ہری گھاس بکھیر دی۔ گھوڑا اسے دیکھ کر گردن ہلاتا ہُوا ہنہنایا ـــــ اور اجنبی سرائے میں داخل ہُوا۔ اُسنے اپنے جھولے میں سے گھر کی کشید کردہ شراب کی بوتل نکالی سرائے کے طعام خانے سے بُھنا ہُوا گوشت لیا اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کر گرم گرم بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ شراب پی اور تکان سے چور اونگھنے لگا۔ پھر سو گیا۔ ـــــ ایسا سویا کہ آج صبح نہ اُٹھا اسکی لاش پر مکھّیاں بھنبھنا رہی ہیں اور باہر کھونٹے سے بندھا گھوڑا اپنے کھُر سے زمین کریدتا ہُوا ہنہنا رہا ہے۔

جب یہ خبر شکاری مرگول نے سُنی تو وہ کانپ اٹھا ـــــ اُسی وقت شہر کی حسین ترین اور متمول ترین عورت کی ملازمہ اُسکے لئے آج رات اُسکے ساتھ گزارنے کا پیغام لیکر آئی۔ اُسنے اُسے دُتکار دِیا اور اپنی بندوق لئے ساحل کی طرف لپکا۔

ساحل پہ کہیں بھی عورت کا وہ جسم اُسے نہ مِلا۔ کل کا پھینکا ہُوا شکار بھی اُسے نہ مِلا تو وہ اندازے سے پہاڑی کی کھوہ کی طرف بڑھا ـــــ وہاں جا کر اُسنے

بے تحاشہ پکارنا شروع کیا ـــــــ "اے عورت . . . ۔ اے عورت . . . اے عورت!" لیکن کھوہ میں سے کوئی آواز نہ آئی پھر اُسنے پاگلوں کی طرح پتھر اُٹھا اُٹھا کر کھوہ میں مارنے شروع کئے ۔ مگر پھر بھی اُسے کوئی جواب نہ ملا ـــــ اور وہ جنگل کی طرف جانے کی بجائے نگر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا ۔

اُس شام تک سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ساتھ والے ملک میں ایک عجیب و غریب بیماری پھیل گئی ہے کہ جو رات کو سوتا ہے وہ زندہ نہیں اُٹھتا ـــــ اور لوگ وہاں سے بھاگ ، بھاگ کر اِدھر اُدھر جا رہے ہیں ـــــ اتنے میں ایک اور خبر ملی کہ نگر کی سرائے کے باہر بندھا ہُوا سفید گھوڑا ابھی آخری بار ہنہنایا پھر کھڑے ہی کھڑے اُسکی آنکھ جھپکی اور دھڑام سے ایسا زمین پر گرا کہ اُٹھ نہ سکا ۔

سارے شہر میں بتیاں جل اُٹھی تھیں ۔ اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے تھے ـــــ کوئی سونے کے لئے تیار نہ تھا ۔ سب اِس خدائی قہر پر تبالہ خیالات کر رہے تھے عورتیں دروازوں کی اوٹ میں کھڑی تھیں اور بچّے مونہہ اُٹھا اُٹھا کر بڑوں کی باتیں سن رہے تھے ۔

کسی طرح بھی وہ رات کٹ گئی ۔ سویرے سمندر کے پانی پر کچھ لاشیں تیرتی دکھائی دیں ۔ وہ ساتھ والے ملک کے لوگوں کی تھیں ۔ سب حیران تھے کہ آخر انھیں نیند اتنی کیوں پیاری ہے کہ جانِ عزیز کھو دیتے ہیں ۔

اندھا شکاری مرگول شہر کی گلیوں میں دیواروں کو ٹٹولتا ہُوا اِس طرح سر جھکائے دھیرے ۔ دھیرے چل رہا تھا ۔ جیسے اُس نے اپنے اندر کوئی بڑا ہی بھیانک راز چھپا رکھا ہے ـــــ وہ اندھا قوتِ مردمی اور بینائی سے محروم آدمی ـــــ آخر کس کام کا تھا ـــــ ؟ مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا ۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا ـــــ اُسنے اپنی بندوق بے دلی سے کندھے پر رکھی تھی ۔

رات بھر سارا شہر بیدار رہا ـــــ وہ پہلی رات تھی ایسا لگا کوئی میلہ سا لگا ہے ۔ کئی جگہوں پر الاؤ جلا دیئے گئے اُن کے گرد لوگ کھڑے ، بیٹھے باتیں کرتے

رات کے گزر جانے کے منتظر رہے۔ بچّے اگر اونگھنے لگتے تو انھیں جھنجھوڑ دیا جاتا۔ "اے بچّے سونا نہیں۔ سونا نہیں میرے بچّے۔" کبھی ماں اور کبھی باپ کی آواز سنائی دیتی نوجوان تو بس بیدار رہ کر خواب دیکھنے میں مشغول تھے۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے۔ اب نیند نے لوگوں کو بُری طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتنا بھی ہوش لوگوں کو نہ رہا تھا کہ رات کو بتیاں جلائی ہیں تو دن میں بجھا دیں۔ سارا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔ باہر والے شہر میں آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور شہر والے وہی ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے سے اُوب گئے تھے۔ انھیں کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ سوائے بیدار رہنے کے اور اپنی جان بچانے کے۔

پھر الکا ایکی۔ بچوں نے گردنیں لڑھکانی شروع کیں۔ اب انھیں تھپڑ مار، مار کر بیدار رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ عورتوں نے اپنے بال رسیوں سے باندھ کر مکان کے چھتوں کی کڑیوں سے باندھ دیتے تھے کہ جب نیند کا جھٹکا لگے درد سے وہ بیدار ہو جاتیں۔ مرد اپنی انگلیوں کو دانتوں تلے دباتے رہتے اور اس طرح وہ اس موت سے اپنے آپ کو محفوظ کئے ہوئے تھے۔ جو چپ چاپ سوتے میں آ کر انسان کو دبوچ لیتی ہے ـــــ مگر اب بیداری بھی ایک مصیبت بننے لگی تھی۔

لگاتار بیداری بھی موت کا باعث بننے لگی۔ میدانوں میں بھاگتے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں مسلسل بیداری کی وجہ سے سرخ ہونے لگیں ـــــ عورتیں اپنے بالوں کے جھٹکوں کا درد اب محسوس نہ کر پاتیں اور بچوں پر تھپڑوں کی بارش بے اثر ہو گئی۔ لوگ کھڑے، کھڑے گرتے اور پھر مر جاتے۔

مسئلہ اب نیند کی ان دیکھی موت کا نہ تھا۔ بڑا مسئلہ تھا۔ بیداری کی موت۔ شہر کے سیانے جن میں ابھی دم تھا اکٹھے ہوئے اور انھوں نے اُن کے بارے میں سوچ بچار کرنا شروع کیا جو عالمِ بیداری میں مرنے لگے تھے۔ کہ اُن کی قوّتِ برداشت اب ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اور وہ اپنی پوری آنکھیں کھولے جو کہ مسلسل بیداری کی

وجہ سے سرخ ہو چکی ہوتیں کھڑے کھڑے مرجاتے ــــ یہ بات تو سب سمجھ ہی چکے تھے۔ کہ موت کا کوئی علاج نہیں ــــ وہ نیند میں بھی آسکتی ہے اور بیداری کی حالت میں بھی لہٰذا سیانوں نے یہ قرار دیا کہ جو عالمِ بیداری میں مرجاتے اُسے شہید کا درجہ دیا جاتے اور جو نیند کے غلبہ سے سر جھکا دے اُسے کایر کی موت سمجھا جائے اور اب کون تھا جو کایر کی موت مرنا پسند کرتا۔

اندھے شکاری مرگول نے اپنی آخری کوشش کی اور کھوہ کے دہانے پر جا کر ایک پتھر زمین سے اُٹھایا اور اندر دے مارا ــــ مگر . . . مگر اندر سے کوئی ردِّ عمل محسوس نہ ہُوا۔ وہ مارے نیند کے بے حال ہُوا جا رہا تھا۔ کئی روز سے اُس نے شکار کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ اُسکی بندوق کی نال زمین سے گھسٹ رہی تھی۔ اور وہ جنگل کی طرف روانہ ہُوا۔ ایک ایک قدم بڑی مشکل سے اٹھاتا ہُوا، اسکا سر لٹک کر سینے پر آگرا تھا۔ کہ اسے ایکا ایکی محسوس ہُوا کہ اب اور نہیں۔ وہ خوفزدہ ہو اُٹھا۔

"نہیں . . . یں . . . یں!" وہ چیخا "میں نے زندہ رہنے کیلئے اپنی بینائی تک قربان کر دی ــــ اور نامردی کی زندگی قبول کی ــــ میں . . . میں مرنا نہیں چاہتا۔"

اُسنے اپنی بندوق اُوپر اٹھائی جسمیں اسے خاصی دِقّت محسوس ہوئی تھی اور پھر ایک خیال اسکے ذہن میں ایک کوندہ کیطرح لپک گیا۔ اس نے بندوق کی نال اپنے ٹخنے پر رکھی اور لبلبی دبا دی۔ "دھائیں۔" کی دل ہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی ــــ درختوں پر سے کچھ پرندے چیختے ہوتے اُڑے اور جنگل میں چھپا ہُوا وہ خرگوش جو مرنے کے بعد مرگول کے کندھے پر سے اُچھل کر جنگل کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اپنے کان کھڑے کر کے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی کی طرف بھاگا ــــ

مرگول مارے شدید درد کے چیخ اُٹھا۔ اُسنے ٹٹول کر اپنے ٹخنے کو محسوس کیا اُسکی انگلیاں کسی سیّال سے لتھڑ گیئں ــــ وہ خون تھا ــــ مگر اب نیند نام کی کوئی چیز اسکے وجود میں موجود نہ تھی ــــ اُسے یہ معلوم ہُوا کہ بیدار رہنے کیلئے ایک زخم کی سخت ضرورت ہے ــــ وہ یہ اطلاع دینے کیلئے شہر کی طرف لپکا۔

اندھا شکاری مرگول لنگڑاتا ہوا شہر کے نگر دوار میں داخل ہوا ـــــ اس سارے چکر میں اُسے کافی دن لگ گئے تھے۔ شہر میں لوگ دھڑا دھڑ شہید ہو رہے تھے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ یہ دن ہے یا رات۔ سب طرف سناٹا تھا ـــــ اسکے گھٹنے میں شدید درد تھا۔ اور وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جا بجا اُسکے پاؤں شہیدوں کی لاشوں سے ٹکرا جاتے۔ وہ گرتا پڑتا، شہر کے وسط میں پہنچا۔ ٹٹول ٹٹول کر چبوترے پر چڑھا اور اپنی پوری طاقت جمع کر کے اپنی بندوق کندھے پر رکھ کر بالکل فوجیوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُسنے لوگوں کو پکارنا شروع کیا۔

" اے شہر کے رہنے والو ـــــ میں نے زندگی کا راز پالیا ہے۔ اور میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ ایک بار میں جنگل سے شکار کر کے لوٹ رہا تھا کہ میں نے ایک سیاہ فام عورت کو بالکل برہنہ سمندر میں سے نکل کر پہاڑی کی طرف جاتے دیکھا ۔۔۔۔۔ اور پھر جو کچھ ہُوا اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ سب زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو بیدار رہنا ہو گا ـــــ اور بیدار رہنے کیلئے ایک زخم کی ضرورت ہے ۔۔۔۔۔ اور زخم ۔۔۔۔ "

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ اسکی بات کوئی نہیں سُن رہا ہے۔ کہیں کوئی حرکت نہیں۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ کہیں کوئی سننے والا نہیں۔ تب اُسنے ایک بار پھر بلند آواز میں کہا۔

" کیا آپ میری آواز سُن رہے ہیں۔! "

مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اپنی اندھی آنکھوں سے فضا میں گھورتا رہا۔ حتےٰ کہ اسکی آنکھیں پانی سے بھر گئیں اور آنکھوں کا پانی اسکے رخساروں تک بہنے لگا ـــــ

شکاری مرگول اندھا تھا۔ وہ یہ دیکھ تو نہ سکا کہ اب شہر میں اسکی آواز سننے والا کوئی نہیں بچا ـــــ لیکن اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی ـــــ شہر بالکل ویران پڑا تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور فضا میں گدھ اور چیلیں اپنے پر پھیلائے خاموشی سے اُڑ رہی تھیں ۔

وہ دھیرے، دھیرے چبوترے سے اترا۔ اور لنگڑاتا ہوا شہر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اُسکی ناک نے پہلی بار سڑی ہوئی لاشوں کا تعفّن محسوس کیا اور وہ ڈر کر تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ سمندر کے ساحل کی نرم ریت اُسکے پاؤں کے نیچے دَب، دَب جاتی تھی کہ اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ ایک خرگوش کا مُردہ جسم تھا —— اُس نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ نرم، نرم بالوں سے بھرا ہُوا سرد جسم وہ اسے اپنی گود میں لیکر وہیں بیٹھ گیا —— اور سمندر کی طرف مونہہ کرکے وسعت کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا —— اُسکی بندوق اُسکے قریب پڑی تھی۔ اسے اپنا وجود بے کار محسوس ہونے لگا۔ اپنی بندوق سمیت اور ٹخنے کے زخم سمیت وہ انتظار کرنے لگا سمندر کی اس لہر کا جو تیزی سے اُچھل کر آئے گی اور اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر سمندر کی گہرائی میں لے جائے گی۔ اچانک اُسے پہاڑی کی کھوہ میں سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ اُدھر پلٹا لیکن اب اُس میں بالکل سکت باقی نہ تھی کہ وہ کھوہ کے دہانے پر جاکر پتھر اُٹھاتا اور اندر دے مارتا۔

سرنگ

گہری تاریکی اور مکمل خاموشی تھی ـــــ سارے احساسات نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کچھ نہیں رہا تھا ـــــ یہ کیفیت کب سے تھی۔ یاد نہیں آرہا تھا۔ اِس سے پہلے کیا تھا ـــــ اس کا بھی علم نہ تھا۔ پھر جیسے کسی ہیولے کی طرح زمین پر اترنے کا احساس ہُوا۔ اور لگا کہ پیٹھ زمین سے لگتی جا رہی ہے۔

دُور کہیں شاید کسی رقص کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رقاصہ نے گھنگرو پاؤں سے باندھ کر زمین پر ایک دو بار ضرب لگائی تھی۔ اُسی کے ساتھ جھنکار سنائی دی، لیکن بہت مدّھم جیسے میلوں دُور سے آئی ہو۔ جیسے صدیوں پہلے کا واقعہ ہو ـــــ پھر لگا کہ وہ آواز جیسے میرے پہلو سے اُبھری ہے۔ اچانک فاصلہ ختم ہو گیا۔ اور واقعہ اسی لمحے کا ہے جس میں، مَیں جی رہا ہوں۔ وقت تھم گیا۔

مَیں جی رہا ہوں ـــــ جیسے اس یقین نے میرے خون کے ساتھ سارے جسم میں سفر کرنا شروع کر دیا ہو ـــــ اور میری چھاتی میں شدید اینٹھن محسوس ہوئی ـــــ ایک ٹیس سی اٹھی۔ میرے جسم میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ گھنگرو پھر بج اٹھے۔ دُور نہیں ـــــ میرے پہلو میں۔ اور مَیں نے اپنے ہاتھ سے اُس جھنکار کو پکڑنا چاہا ـــــ میری انگلیاں سرد لوہے کے حلقوں سے چُھو گئیں ـــــ مَیں چونکا اور آنکھیں کھول دیں ـــــ اندھیرا بدستور موجود تھا ـــــ میری انگلیاں ایک لمبے سرد آہنی سلسلے پر کبھی آگے اور کبھی پیچھے پھسل رہی تھیں ـــــ تو . . . تو کیا یہ گھنگرو . . . ؟ نہیں۔!

نہیں، یہ ایک آہنی زنجیر تھی، جو میرے سینے کے گرد لپٹی ہوئی تھی ـــــ اتنی سختی سے کہ ہلنا جلنا بھی مشکل تھا ـــــ اور مَیں زمین پر لیٹا ہُوا تھا ـــــ اور زمین کے رگ و ریشے میں

سیلن پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس احساس ــــ جسم میں شدید درد کا ــــ زنجیروں میں جکڑے ہوئے جسم کا اور جسم کے نیچے سیلن بھری زمین کا۔

اِس سے پہلے کیا تھا ــــ ؟ میں نے سوچنا شروع کیا ــــ یہ کیفیت ابدی نہیں ہو سکتی۔ اس سے پہلے ضرور کچھ ہو گا ــــ لیکن ذہن میں درد کا احساس اتنا شدید تھا کہ کوئی دوسری بات سوجھتی نہ تھی ــــ میں جس حال میں تھا ــــ کچھ مدت تک اُسی حال میں پڑا رہنا مناسب سمجھا ــــ

لیکن عجیب بات تھی ــــ بے حسی میں صدیاں بیت گئی تھیں مگر احساس کی بیداری کے بعد ایک لمحہ بھی اِس کیفیت میں نہیں گزارا جا رہا تھا ــــ میں نے اٹھنے کی کوشش کی ــــ مکمل کوشش اور وہ کوشش ناکام رہی ــــ پھر کوشش کی اور ۔ ۔ ۔ اور پھر میں اٹھنے میں کامیاب ہو گیا ــــ

میں نے بیٹھ کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ زنجیر کتنی لمبی ہے۔ میں نے اُسے ہاتھوں میں لیکر اپنی طرف کھینچنا شروع کیا ــــ پہلی بار مجھے معلوم ہُوا کہ میرے ہاتھ بھی بری طرح زخمی ہیں۔ کوئی سیّال بار، بار زنجیر کے حلقوں اور میرے ہاتھوں میں چپک جاتا تھا۔ شاید وہ خون تھا ــــ لیکن میں زنجیر کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ ہاتھوں کے ساتھ چپکنے والے خون اور زخمی ہاتھوں سے اٹھنے والے درد کی پرواہ کیئے بغیر اور پھر جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا ــــ زنجیر تو اور باقی تھی لیکن اُسے کھینچا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا دوسرا سرا کہیں بندھا ہُوا تھا۔ کہاں بندھا تھا ــــ اور کس چیز سے بندھا تھا۔ یہ جاننے کے لئے زنجیر کے سہارے آگے بڑھتے ہوئے وہاں پہنچنا تھا ــــ اور میری جسمانی حالت اس مشقت کیلئے بالکل اجازت نہ دے رہی تھی ــــ

لیکن نہیں ــــ ایک جگہ مردہ حالت میں کیسے پڑا رہا جا سکتا ہے؟ میں نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور زنجیر کو پکڑ پکڑ کر آگے کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ میرا سر اچانک کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر کر کے اس چیز کو معلوم کرنے کی کوشش کی ــــ یہاں سے وہاں تک کھُردرے پتھروں کا سِلسلہ تھا ــــ تو گویا وہ چھت

تھی ـــــ اُس جگہ جہاں میں موجود تھا ـــــ بہت ہی نیچی چھت، کہ ذرا بھی سر اٹھایا جائے تو سر اُس سے ٹکرا جائے ـــــ لہٰذا سر جھکا کر آگے بڑھنا ہو گا ـــــ اور میں پھر آگے بڑھنے لگا ـــــ جلد ہی میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں زنجیر کا آخری حلقہ بندھا تھا۔

وہ پتھر کی دیوار میں ٹھونکا ہُوا ایک بڑا سا کیل تھا۔ جس میں ایک بڑا سا لوہے کا کڑا تھا ـــــ اور اس کڑے کے حلقے میں زنجیر کا آخری حلقہ پڑا ہُوا تھا ـــــ زنجیر میں اور کڑے میں لچک موجود تھی ـــــ لیکن نجات ناممکن ـــــ

میں نے مایوسی کے عالم میں گال پُھلا کر اندر کی ہُوا باہر نکال دی۔ اور بے حرکت ہو کر بیٹھ گیا ـــــ اور پھر سوچنے کی کوشش کی کہ آخر یہاں پہنچا کیسے ـــــ؟ لیکن ... لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا ـــــ اور میں ایسی ناقابلِ برداشت حالت میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے غصّہ میں آ کر پورے زور سے زنجیر کو ایک جھٹکا دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ برآمد ہُوا ـــــ سوائے اِس کے کہ زنجیر کھنک اُٹھی اور پھر وہ آواز بھی تاریکی میں ڈوب گئی۔

میں نڈھال ہو کر بیٹھ گیا ـــــ اور اِس حالت سے چھٹکارا پانے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا ـــــ پھر غیر ارادی طور پر میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں ـــــ ان میں کوئی خاص چیز نہ تھی۔ سوائے سگریٹ کے ایک تُڑے مُڑے پیکٹ اور ماچس کے۔

میرے ذہن میں جیسے کوندہ سا لپک گیا ـــــ میں نے ٹٹول۔ ٹٹول کر ایک دیا سلائی نکالی اور اُسے روشن کرنے کی کوشش کی۔ ایک دو ضربوں کے بعد وہ جل اُٹھی۔ اور سارے میں روشنی پھیل گئی۔ میری آنکھیں اِس روشنی میں لمحہ بھر کے لیے چندھیا گئیں ـــــ اور میں نے دیکھا کہ میرے دائیں ایک لمبی سرنگ ہے۔ اور بائیں جہاں سرنگ ختم ہوتی ہے۔ وہاں زمین پر ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہُوا ہے۔ اس کے کپڑے بدستور موجود ہیں۔ لیکن جسم پر سے سارا گوشت نُچا ہُوا ہے ـــــ میں لرز سا گیا اور دیا سلائی ختم ہو کر بُجھ گئی ـــــ

اندھیرے میں بھی ـــــ اُس کے گلے میں بندھی ہوئی ٹائی مجھے یاد آ گئی تو کیا وہ مجھ سے پہلے ـــــ؟ تو اسکا مطلب ہے رہائی آسان نہیں ـــــ میں

نے بے دھیانی میں سگریٹ پیکٹ سے نکالا اور اُسے ہونٹوں میں دباکر ایک اور دیاسلائی جلائی۔ سگریٹ سلگ گیا اور ایک نظر پھر اس ڈھانچے پر ڈالی — وہ بدستور پڑا تھا۔ گلے میں بندھی ٹائی اور گوشت کے بغیر ہڈیوں کا ڈھانچہ — دیا سلائی بجھ گئی اور سگریٹ میرے ہونٹوں میں کانپنے لگا۔

کش لگانے سے سگریٹ کا جگنو چمک اُٹھتا اور روشنی کا ایک ہالہ سا بن جاتا۔ جس میں، میں اپنی بے بسی کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہُوا۔ کہ یہ زنجیر زور دار جھٹکوں سے نہیں ٹوٹے گی۔ لیکن آہستہ، آہستہ اگر اسے ہلاتے رہا جائے تو کیل اپنے سوراخ میں ڈھیلی پڑ سکتی ہے — لیکن کب تک؟ اب یہ سوچنے سے فائدہ جب اور کوئی چارہ ہی نہ رہ گیا ہو —

میں نے سگریٹ کے آخری حصّے تک اس کا لطف لیا۔ اور پھر جب میری انگلیاں کش کی حدّت سے جلنے لگیں تو میں نے اُسے پھینک دیا۔ ایک گہری سانس لی اور زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آہستہ، آہستہ ہلانے لگا — آواز ایک خاص ردم سے اُبھرتی تھی۔ جیسے کوئی ساز بج رہا ہو — اور ایک مخصوص تال پر۔

یہ سلسلہ کتنی دیر تک جاری رہا مجھے یاد نہیں لیکن میں نے جب رُک کر ایک بار ہاتھ آگے بڑھا کر کیل کو پکڑا تو وہ واقعی کچھ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ وہ لمحہ انتہائی انبساط کا تھا۔ میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میرے سارے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔

اب میں نے کیل کو پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔ جنبش پہلے بہت کم تھی۔ پھر ذرا بڑھی اور پھر ذرا اور۔ اور پھر کافی زیادہ تھی — اور کیل بھی کافی لمبی تھی۔ لیکن ایک موقعہ اب آیا جب کیل پتھّروں سے ڈھلک کر میرے ہاتھ میں آگیا — اب میں آزاد تھا۔ میں نے وفورِ جوش سے آگے کی طرف رینگنا شروع کیا — سرنگ کی اونچائی بھی آہستہ، آہستہ بڑھنے لگی اور اب میں بالکل سیدھا کھڑا ہو کر چل سکتا تھا — میری چھاتی کے گرد کسی ہوئی زنجیر میرے پیچھے گھِسٹتی ہوئی چلی آرہی تھی میرے قدموں کی آواز اور زنجیر گھسٹنے کی آواز آپس میں بالکل خلط ملط ہو چکی تھیں۔ یہ

سارا ماحول مجھے زندگی کا ہی ایک حصہ معلوم ہونے لگا تھا ــــ کہ اچانک میں رک گیا۔ میرے قدموں کی آواز اور زنجیر کے گھسٹنے کی آواز بند ہو گئی ــــ لیکن ....

لیکن ایک اور آواز سنائی دی۔ ایک بالکل اجنبی آواز ــــ میں ہمہ تن گوش ہو کر اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا ــــ یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔

تو کیا وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ــــ ؟ نہیں، آواز سامنے سے آرہی تھی ــــ میں نے جیب میں سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ اور ایک دیا سلائی جلائی۔ سرنگ میں روشنی پھیل گئی۔ دُور سامنے جہاں جا کر روشنی دم توڑ رہی تھی ــــ مجھے فرش پر دو سرخ سی چنگاریاں دکھائی دیں۔ اور پھر دیا سلائی بجھ گئی۔ سب طرف پہلے کی طرح اندھیرا چھا گیا۔ جیسے ہی میں اندھیرے سے ذرا مانوس ہوا میں نے دیکھا وہ دونوں چنگاریاں آہستہ آہستہ میری طرف رینگ رہی ہیں۔ اور قدموں کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

میں نے جلدی سے ایک اور دیا سلائی جلائی ــــ اب میں نے دیکھا کہ وہ دو سُرخ سُرخ آنکھیں ہیں۔ ایک بلی کے قد کے چوہے کی ــــ جس کے بال سور کی طرح اس کے جسم پر کھڑے ہیں اور وہ میری طرف انتہائی پراسرار نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ پھر ایکا ایکی اُسنے اپنے سفید دانت دکھائے ــــ

تو کیا اُس کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں اُسی نے بدل دیا ؟ ایک بے بس، زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں اس نے بدل دیا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسنے مجھ پر ایک چھلانگ لگائی۔ دیا سلائی بجھ کر گر گئی۔ اور اندھیرے میں وہ میرے چہرے سے ٹکرا کر میرے کندھے پر گرا اور پھر اُس نے اپنے نوکیلے دانت میری گردن میں پیوست کر دیئے۔

میں بے ارادہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور پھر میں نے اپنی انگلیوں میں اُسکی گردن محسوس کی اور میں نے پوری طاقت سے اُسے اپنی گردن سے کھینچ لیا۔ اور اتنے زور سے اپنی انگلیوں میں مسلا کہ اُس کے اندر کا مواد باہر نکل کر میرے

ہاتھ پر بہنے لگا میں نے اُسے انتہائی کراہیت سے ایک طرف پھینک دیا ــــ میری گردن میں سے گرم گرم خون نکلنے لگا تھا اور شدید درد کا احساس ہونے لگا تھا۔

میں نے ایک اور دیا سلائی جلائی اور دیکھا کہ وہ فرش پر مردہ پڑا ہے۔ اُس کا سارا وجود گوشت کے ایک لوتھڑے میں بدل چکا تھا۔

میں نے پھر آگے بڑھنا شروع کیا ــــ اب میں ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے سرنگ دو طرف جاتی تھی ــــ دائیں اور بائیں ــــ! کدھر جانا چاہیئے ــــ رہائی کا راستہ کونسا ہے ؟ میں ایک لمحہ رُک کر سوچنے لگا ــــ لیکن فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے اندھیرے میں دیا سلائی کی ڈبیہ اُچھالی ــــ جو میرے پاؤں کے قریب ہی گری ــــ میں نے ٹٹول کر اُسے اٹھایا۔ بڑی احتیاط سے ویسے ہی سیدھا اور پھر اس میں سے دیا سلائی نکالنے کے لئے اسے کھولا ــــ اوہ ــــ! یہ آخری دیا سلائی تھی ــــ میں اس خیال سے ہی کانپ اٹھا کہ اگر راستے کا تعین ٹھیک نہ کر پایا تو پھر روشنی کہیں سے نہ ملے گی۔ میں نے دیا سلائی رگڑ کر جلائی ــــ اوپر ڈبیہ کا سیدھا حصہ تھا۔ یعنی مجھے بائیں جانا تھا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں اور زنجیروں کے وزن کے ساتھ بائیں طرف مڑ گیا اور ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیکر آگے بڑھنے لگا۔ جیسے، جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا سرنگ کی چھت نیچی ہوتی جا رہی تھی۔ حتےٰ کہ مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اب سیدھا چلنا مشکل ہے۔ میں نے سر ذرا سا جھکا دیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اب میرے پاس دیا سلائی نہ تھی کہ روشنی میں راستہ دیکھ سکتا ــــ لیکن پھر ایک ایسی منزل آگئی جہاں سے دو راستے نکلتے تھے۔ یعنی ایک اور راستہ بائیں طرف جاتا تھا۔

میں سر جھکائے ہوئے تنگ آگیا تھا۔ میری گردن اینٹھ سی گئی تھی۔ میں نے وہ پہلا راستہ چھوڑ دیا اور ایک بار پھر بائیں طرف مُڑ گیا ــــ اب یہ تو دو، تو قدم کے بعد راستہ پھر بائیں طرف نکلتا تھا ــــ میں ہر بار بائیں طرف مڑتا رہا ــــ اور پھر تھک کر بالکل نڈھال ہو گیا۔ میرے ذہن میں یہ احساس پوری شدت سے پیدا ہوا

کہ نجات کا کوئی راستہ نہیں ـــــ اور میں کسی بھول بھلیاں میں پھنس گیا ہوں۔ میری ٹانگوں نے بالکل جواب دے دیا ـــــ چھاتی کے گرد بندھی ہوئی زنجیر کے وزن سے کمر خم ہوگئی میں کچھ دیر لڑکھڑاتا رہا اور پھر زمین پر گر گیا۔

میں کتنی دیر تک وہاں پڑا رہا مجھے یاد نہیں۔ ایک بار پھر میں بیدار ہوا میں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنے اردگرد کو جاننے کی کوشش کی۔ زمین سیلی ہوئی تھی۔ دیواریں پتھریلی اور کھردری تھیں اور چھت بہت نیچی تھی۔

میں نے زمین پر رینگنا شروع کیا۔ رینگتا، رینگتا میں پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے اب ایک اور راستہ دائیں طرف جاتا تھا ـــــ میں اُس طرف مڑ گیا ـــــ تھوڑا ہی آگے گیا تھا، کہ ناک ایک عجیب طرح کے تعفّن سے بھر گئی۔ جیسے ذبح خانے میں کچے گوشت کی بُو ہوتی ہے۔ میں ٹھٹھکا اور واپس پلٹا ـــــ پھر دیوار کے سہارے چلتا ہُوا آگے بڑھنے لگا ـــــ اب دائیں بائیں کا احساس ختم ہوگیا تھا ـــــ اور میں اس سرنگ میں سے باہر نکلنے کے سلسلے میں بالکل مایوس ہوگیا تھا۔

میں نے پھر یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں یہاں، کیسے آیا تھا؟ ـــــ کون لایا تھا مجھے یہاں ـــــ؟ میرے ذہن میں ایک چہرہ اُبھرا ـــــ میں نے باہر سے دروازہ کھولا تھا ـــــ جیسے ہی اندر داخل ہُوا وہ سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسکی گود میں ۴۵ بور کا ایک ریوالور تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے۔ مسکراہٹ نظر آرہی تھی مگر چہرہ غائب تھا۔ یا پھر موٹے فریم کے گاگلز تھے جو اس کے چہرہ کو چھپاتے ہوئے تھے۔ سر پر بڑا سا ہیٹ تھا۔

اُس نے آہستہ سے ریوالور اُٹھایا اور اُس کا رخ میری طرف کر دیا۔

" میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا" وہ بولا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھا " آؤ میرے ساتھ"۔ اُس نے پھر کہا

" لیکن کہاں ـــــ؟ اور تم کون ہو ـــــ؟ میں نے سہم کر سوال کیا۔

" سوال نہیں ـــــ بس چلو" اُس نے ریوالور لہرایا اور پھر آگے چلنے کا اشارہ

کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

دوسرے ہی لمحہ اُسکا ریوالور بدستور میری پسلیوں میں دھنس گیا تھا۔ اور ہم دونوں گلیارے میں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ پھر ہم دونوں لفٹ کیلئے رُکے اور لفٹ آ گئی ـــــ اُسنے مجھے اندر دھکیلا اور خود بھی اندر آ گیا۔ ریوالور بدستور میری پسلیوں سے لگا ہُوا تھا ـــــ ہم دونوں خاموش تھے۔ اور لفٹ نیچے کی بجائے اوپر کو جا رہی تھی۔

جب لفٹ اپنی منزل پر پہنچ گئی تو ہم اترے ـــــ یہ میرے مکان کی چھت تھی۔ اور وہ اسی طرح سے مجھے کوَر کئے ہوئے تھا ـــــ اُسنے مجھے چند قدم چلنے کا اشارہ کیا۔ اور ہم دونوں سیڑھیوں کے قریب جا پہنچے ـــــ اُسنے ایک ہاتھ بڑھا کر ٹیرس کا دروازہ کھول دیا ـــــ اور مجھے سیڑھیاں اترنے کا اشارہ کیا ـــــ ہم سیڑھیاں اترنے لگے۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے ـــــ نہ جانے کتنی سیڑھیاں تھیں اور ہم کب تک اترتے رہے ـــــ خدا خدا کرکے ہم نیچے پہنچے اور عمارت سے باہر نکلے۔ رات کا اندھیرا سب طرف پھیلا ہُوا تھا اور اس اندھیرے میں سامنے ایک موٹر کار کھڑی نظر آئی ـــــ اُسنے ریوالور والا ہاتھ ہلا کر موٹر کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مَیں انتہائی خوفزدہ ہو چکا تھا اور اسکا یہ حکم مانے چلا جا رہا تھا۔

اُس نے میرے لیے موٹر کا پچھلا دروازہ کھولا۔ مَیں سر جھکا کر اندر داخل ہونے لگا کہ میرے سَر پر ایک بھرپور ضرب لگی۔ شاید اُس نے ریوالور کا کُندہ مارا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے اور پھر مَیں بے سُدھ ہو کر اندھیری وادی میں ڈوب گیا۔

تو اسکا مطلب ہے۔ وہی مجھے یہاں لا کر چھوڑ گیا تھا ـــــ زنجیر سے جکڑ گیا تھا۔ اور خود باہر نکل گیا تھا۔ اگر وہ باہر نکل گیا تھا تو باہر نکلنے کا راستہ ضرور ہو گا۔ اس خیال سے مَیں پھر جیسے زندہ ہو گیا۔ مَیں اُٹھا اور پھر چلنا شروع کیا۔ کسی سمت کا تعین کئے بغیر۔

مجھے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مَیں رُک گیا ــــ یہ بالکل ویسی ہی آواز تھی جیسی اُس آدم خور چوہے کے قدموں کی آواز ــــ لیکن اِس بار یہ ایک آواز نہ تھی۔ کئی تھیں ــــ تو کیا وہ یہاں بہت سے ہیں ــــ؟

آہٹیں ہر پل قریب آرہی تھیں۔ مَیں گھبرا کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ آہٹ بدستور میرا پیچھا کررہی تھی۔ مَیں بھاگتا رہا اور پھر اچانک ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ تازہ ہوا۔ اور مَیں خوشی سے پاگل ہوا ٹھا ــــ اور تیزی سے بھاگنے لگا ــــ سامنے روشنی دکھائی دینے لگی اور اس روشنی میں۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا ہزاروں کی تعداد میں آدم خور چوہے اپنی سرخ آنکھیں مجھ پر جمائے میرے پیچھے بھاگے آرہے تھے۔ اور پھر یکدم میرے قریب آکر مجھ پر لوٹ پڑے مَیں اُن کے ساتھ ایک بے معنیٰ اور بے نتیجہ جنگ میں شامل ہوگیا۔ وہ اپنے نوکیلے دانت یہاں وہاں میرے جسم پر گاڑ رہے تھے۔

مَیں نے پھر بھاگنا شروع کیا ــــ اب وہاں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو اوپر کو جاتی تھیں۔ اُن کے کاٹنے کی تکلیف کی پرواہ کئے بغیر میں وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اور پھر مَیں اُس سرنگ سے باہر تھا ــــ جیسے ہی مَیں نے سر باہر نکالا مَیں نے دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ۴۵ کا ریوالور لیئے سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر گاگلز لگائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلائے بیٹھا میرا منتظر تھا۔ مَیں آگے بڑھ کر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا ــــ میرے جسم کے ساتھ اب بھی کئی چوہے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور اُسنے ریوالور کی نال میری طرف کردی۔

اچانک نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ مَیں نے اپنے دائیں پاؤں کی ٹھوکر اس کے جبڑے پر ماری اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا یہ حملہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ ڈھلان سے لڑھکنے لگا۔

مَیں نے بے تحاشہ گولیاں چلانا شروع کیں اور کئی چوہے اُچھل، اُچھل کر گرنے لگے ــــ پھر مَیں نے اپنے جسم سے چپکے ہوتے چوہوں کو پکڑ پکڑ کر پھینکنا شروع کیا۔

اور پھر بے تحاشہ ڈھلان پر بھاگنے لگا ــــــ

باہر زرد چبھتی ہوئی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میرے جسم سے پسینہ فوارے کی طرح پھوٹنے لگا۔ لیکن میں خوش تھا۔ اُس تکلیف سے یہ تکلیف الگ تھی۔

میں کافی دُور نکل آیا تھا ـــــ اور پھر میں نے پلٹ کر سُرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا آدم خور چوہے اب بھی وہاں اُچھل کود کر رہے تھے۔

اچانک میں نے نیچے وادی میں دیکھا ـــــ بہت سے آدمی ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے نصف دائرے کی شکل میں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اور مجھے دیکھ کر انکے سفید دانت دھوپ میں چمکنے لگے تھے۔

اُن کا حلقہ دھیرے دھیرے میرے گرد تنگ ہُوا جا رہا تھا۔ اور انکے چہروں پر خوشی کے تاثرات زیادہ اُبھر کر ظاہر ہو رہے تھے۔ حتّیٰ کہ وہ میرے قریب آگئے اور اُنھوں نے اپنی لاٹھیاں سونت لیں ـــــ میں حیران رہ گیا۔ تو کیا یہ میرا شکار کرنا چاہتے ہیں۔؟ اِس احساس سے میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا ـــــ اور میں پیچھے کی طرف بھاگنے لگا ـــــ وہ بھی میرے پیچھے بھاگنے لگے۔

اور میں ـــ میں دوبارہ اسی سرنگ کی طرف بڑھ رہا تھا جس سے بمشکل رہائی ملی تھی۔ جہاں آدم خور چوہے مارے بھوک کے اُچھل کود مچا رہے تھے اور میرا جسم ابھی تک زنجیر سے جکڑا ہُوا تھا۔

جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں

ہزاروں ورش پہلے کی بات ہے۔"اُس" نام کی ندی کے کنارے "وہ" نام کا ایک نگر بسا ہُوا تھا جس میں "مَیں" نام کا ایک وِیکتی رہتا تھا۔

جب "مَیں" کے مصلوب ہونے کی خبر ہم تک پہنچی تو ہم جنگل سے کاٹی ہوئی تمام لکڑیاں ندی میں بہا چکے تھے، اور ندی کسی پاگل سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی کالے سمندر کی طرف بڑھی چلی جارہی تھی۔

"ہم بھی کتنے بے مقدرے لوگ ہیں!" ہمارے باپ نے اپنی ڈاڑھی کے سفید بالوں میں پھنسے ہوئے خس وخاشاک جھٹکتے ہوئے کہا۔"اب مصیبتیں آئیں گی اور برف کے جھکڑ چلیں گے مگر ہمارے پاس الاؤ جلانے کے لئے ایک تنکا بھی نہ ہوگا۔"

ہمارے باپ کا چہرہ مرجھایا ہُوا تھا۔ لمبی ڈاڑھی کے سفید بال تیز ہوا میں اُڑنے لگے تھے۔ ہم نے اپنے کلہاڑوں پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کی آنکھوں میں مدّوجزر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ہم پر جما رکھی تھیں اور برابر اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مبادا ہم بچّوں کا دِل ٹُوٹ جائے۔

ہماری بہن نے، بُھنے ہوئے گوشت کے قتلے اپنی جھولی میں سمیٹتے ہوئے پوچھا: "مَیں کو کل کتنی بار مصلوب کریں گے؟"

"ایک بار پھر!" ہمارے باپ نے مختصر سا جواب دیا، اور ندی میں کوئی وزنی پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔"آؤ قبرستان میں آنے والے نئے تابوت کو مقفّل کردیں!" ہم اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ابھی قبرستان کے گرد چہار دیواری نہیں تعمیر ہوئی تھی اور انگور کی بیلوں میں

پھدکنے والی چڑیوں کو غلیل سے مار گرانے کا حکم نہیں ہوا تھا۔ سب آزاد تھے۔ شہتوت کے پتّوں پر پلنے والے ریشم کے کیڑے تک ــــ مُردا پنے لمبے ناخنوں سے قبریں کھودتے تھے اور عورتیں اپنے لمبے بالوں سے زمین سے مٹّی ہٹاتی تھیں۔

یہ قبرستان ہے یہاں ہر تابوت پر اس کی ولادت کی تاریخ ڈال کر قرینے سے اور نمبر شمار کے مطابق رکھ دیا جاتا ہے ــــ سب تابوتوں پر گرد جمی ہوئی ہے سوائے نئے تابوت کے۔

"کھول کر دیکھ لو، کہیں یہ تابوت خالی تو نہیں؟ کیونکہ یہ 'میں' کا تابوت ہے!" ہمارے باپ کی آواز گلو گیر تھی۔

ہمارے بھائی نے بڑھ کر تابوت پر "میں" کی ولادت کی تاریخ ڈالی اور اس پر لکھا "یہ تابوت خالی ہے، کیونکہ یہ 'میں' کا تابوت ہے؟" اور پھر اسے انگور کے پتوں سے ڈھانپ دیا۔

ہم پھر ندی کے کنارے آکر بیٹھ گئے، جس میں ہم نے اپنے ہاتھوں سے کاٹی ہوئی لکڑیاں بہادی تھیں اور ندی دھیرے، دھیرے کالے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اِستے میں "وہ" نگر ہے اندر تربوز انسانی کھوپڑیوں کی طرح کاٹ کر بکتے ہیں۔ اور شہر کے دروازے پر ہمارے دوستوں کے سر لٹکے ہوئے ہیں۔ جن کی کٹی ہوئی گردنوں سے ٹپ، ٹپ خون ٹپکتا ہے۔

"سب کچھ مٹ جائے گا مگر پتھر پر ٹپکے ہوئے خون کے دھبے نہ ہٹ پائیں گے!" ہمارے باپ نے ندی میں اپنا منہ دھوتے ہوئے کہا۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے گیلے بال آپس میں چپک گئے تھے۔

ہماری بہن نے فکر مندی سے اس کے چہرے پر دیکھا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارے چہرے پر ڈھل جانے کے باوجود کچھ نشان باقی ہیں!"

ہمارے باپ نے مکرّر اپنا چہرہ دھویا اور اس وقت تک اپنی ہتھیلیوں میں چھپائے

رکھا جب تک سارے میں اندھیرا نہ پھیل گیا۔

اندھیرے میں سب چیزیں سیاہ ہو گئی تھیں۔ آسمان، ندی کا پانی اور اس کے کنارے اُگی ہوئی گھاس بھی۔

" تم بیٹھو اس لئے داستان سناؤ گے اور پھر جب تم باپ بن جاؤ گے تو تمہارے بیٹے تمہیں داستان سنائیں گے۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ داستان ماضی کی نہیں ہوتی۔ حال کی۔ جھیل میں پاؤں لٹکا دو اور ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو دیکھو!" ہمارے باپ نے اپنی بدلی ہوئی آواز میں ہمیں سمجھایا۔

ماحول سارے کا سارا پُراسرار ہو گیا تھا۔ دُور نئے تابوت پر پھیلی ہوئی انگور کی بیلوں میں چڑیاں دبک کر سو گئی تھیں۔ شہر کے دروازے میں کچھ گھوڑ سوار داخل ہوئے اور پھر قندیلیں بجھ گئیں۔ ہمارے دوستوں کے کٹے ہوئے سروں میں سے ٹپکتا ہوا خون پتھروں پر گر گر سیاہ دھبّوں میں منتقل ہو رہا تھا۔

صبح جب ہم سو کر اٹھے تو ہمارا باپ مر چکا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ بدستور اپنی ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔

" میں " کے خالی تابوت میں اس کی لاش رکھ دی گئی اور ہمارے بھائی نے بڑھ کر اس کا یومِ ولادت لکھا اور پھر یہ لکھ کر کہ " میں " کے تابوت میں اس کا جسم رکھ دیا گیا ہے اس دن کے لئے جب " میں " کو دوبارہ مصلوب کیا جائے گا تاکہ وہ اس کا نظارہ خود کر سکے اور جی بھر کر پچھتا سکے!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ہماری بہن نے بُھنے ہوئے گوشت کے قتلے سنبھالے اور اپنے بچوں کی تلاش میں ندی کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ اور ہم اپنے بچوں کی تلاش میں شہر کی طرف پلٹے۔

جنگل میں زوروں کی برف باری شروع ہو چکی تھی، اور ہمارے کلہاڑے برف میں دَب گئے تھے۔ دُور سے ہماری بہن کے بینوں کی آواز آ رہی تھی۔

" ہم جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں۔

لکڑیاں!

ندی ہمیں بلاتی ہے۔ بلاتی ہے

بے رحم ندی!

سمندر تک لے جاتی ہے۔ لے جاتی ہے

بے رحم ندی!

ہزاروں ورش پہلے کی بات ہے، اُس ندی کے کنارے وہ نگر بسا ہُوا تھا جس میں مَیں رہتا تھا۔

نگر کے لوگوں نے اپنا سب کچھ ندی میں بہا دیا، حتّےٰ کہ ان کے پاس بچوّں اور اناج کے سوا کچھ بھی نہ رہ گیا۔ اُن کے لباس سیاہ تھے اور سروں پر سفید کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ سب اپنے سینے پر ہاتھ باندھے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔

رات دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی آ رہی تھی اور ندی رُوں، رُوں کرتی کالے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی اور سب دیکھ رہے تھے کہ ندی کی جھول کتنی بوجھل ہے کیونکہ ان کا سب کچھ اس کی جھول میں تھا۔ پھر رات آئی اور ندی کا پانی سیاہ ہو گیا۔

صبح جب سب سو کر اٹھے تو کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ کیا، کیا کچھ تھا جو ضائع ہو گیا اور اُس پر کتنی محنت صرف ہو چکی تھی۔ کیونکہ جو شخص اپنے سینے پر ہاتھ باندھے سب سے آخر ندی میں کودا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

" ندی سے اَن گنت ہاتھ اُبھریں گے اور ساری چیزیں بحفاظت کناروں پر رکھ دیں گے۔!"

اُس ندی کے کنارے بسے ہوئے نگر میں، مَیں رہتا ہوں۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ مَیں بہت اداس تھا اور گھومتا گھماتا ندی کے کنارے چلتا ہُوا بہت دُور نکل گیا۔ پورب سے پچھم کی طرف بوجھل ہَوا چل رہی تھی۔ پیڑ پودے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ کئی بار خیال آیا کہ شاید یہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں پھر سوچا میری اور ان کی آخر شناسائی ہی کیا ہے۔؟

ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہُوا کہ اب آگے جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ ندی اتنی پھیل

گئی تھی کہ پاؤں رکھنے کو زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے رک کر سب طرف دیکھا۔ سب طرف بے کراں وسعت تھی۔ ایکا ایکی ندی میں سے چھپاکوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دور سے ایک ننھی سی کشتی میری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی اور وہ آواز، چپّو چلانے کی تھی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ کشتی کچھ اور قریب آئی تو پتہ چلا کہ کشتی پر کوئی سوار نہیں ہے۔ اور وہ چپّو دراصل ہاتھ ہیں جو تیرتے ہوئے آدمی کے ہاتھوں کی طرح چل رہے ہیں۔

چند ہی منٹ بعد وہ کشتی جو کہ ایک پُرانا پانی کا کھایا ہُوا لکڑی کا بڑا صندوق تھا، میرے بالکل قریب آکر رک گئی۔ پانی اس کے نیچے سے پھسل کر بہہ رہا تھا۔ اور اس کے پیندے میں سے کچھ ہاتھ مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنے پاؤں ندی میں ڈال دیئے۔ پانی کچھ زیادہ گہرا نہ تھا۔ میں جلد ہی اُس صندوق کے قریب پہنچ گیا۔

سب طرف خاموشی تھی۔ دھندلکا تھا اور وہ ہاتھ ایسے میں مجھے بڑے مہربان لگے پھر وہ ہاتھ میری طرف سیدھے ہو کر دا ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ پتہ چلا کہ چہروں کے علاوہ بھی چیزیں تاثرات پیدا کرتی ہیں اور زبان کے علاوہ بھی چیزیں بول سکتی ہیں۔

نہ جانے کیوں مجھے احساس ہُوا کہ انھوں نے اپنی بات کہہ دی ہے اور میں نے انکی بات سمجھ لی ہے۔ پھر وہ ہاتھ پانی میں گرے اور غائب ہو گئے۔ صندوق میرے سامنے ہلکورے کھا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس صندوق کو اپنی طرف کھینچا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دھکیلتا ہُوا اپنے گھر تک لے آیا۔

ندی کنارے بسے ہوئے جس نگر میں، مَیں رہتا ہوں اس میں زوروں سے افواہ گرم ہو گئی کہ مجھے ندی میں سے ایک پرانا صندوق مِلا ہے۔ جس میں کوئی قدیم خزانہ بھرا ہُوا ہے۔ صندوق پر بہت بڑا مضبوط قفل لگا تھا، جسکی چابی ہمارے پاس نہیں۔ صندوق کے اوپر والے تختے پر کچھ تحریر تھا جو ہم پڑھ نہیں سکتے۔ ہزاروں لوگ اس صندوق کو ہر روز دیکھنے کے لئے آتے اور مجھ سے پوچھتے کہ وہ مجھے کہاں سے اور کیسے مِلا۔ مجھے بار بار اس کے ملنے کی داستان سنانا پڑتی۔

آخر یہ خبر حکومت تک پہنچ گئی۔ ایک روز حاکم لوگ میرے گھر پر آئے اور انھوں نے
مجھے حراست میں لے لیا کہ میں نے خود سے ایسے خزانہ ملنے کی خبر کیوں نہیں دی۔ اور یہ
طے پایا کہ اِسے کھولا جائے۔

کئی طاقتور لوگ بڑے، بڑے ہتھوڑے لے کر آئے اور قفل پر پے در پے کئی چوٹیں
کیں۔ کافی دِقتوں سے قفل ٹوٹ گیا۔

سب نے مل کر ڈھکنا کھولا اور پھر فضا میں چیخیں گونج اٹھیں۔ ان چیخوں کی گونج
میں میری گھٹی، گھٹی چیخیں بھی شامل تھیں۔ لوگ مارے خوف کے بھاگنے لگے اور پھر آخر
صرف میں ہی وہاں اکیلا رہ گیا۔

بات بالکل صحیح تھی۔ میں نے اور ان سب نے جو کچھ دیکھا تھا۔ بالکل ٹھیک تھا۔
اس تابوت میں میری ہی لاش رکھی ہوئی تھی۔ لاش کے سر، ہاتھوں اور پیروں میں
سوراخ تھے۔

یہ طے پا گیا ہے کہ ندی کنارے بسے ہوئے جس نگر میں، میں رہتا ہوں اس کے بڑے
چوراہے پر مجھے مصلوب کر دیا جائے اور میری لاش کو اسی تابوت میں رکھ کر اس پر میرا
یومِ ولادت لکھ کر ندی میں پھینک دیا جائے۔ تاکہ آئندہ جب کبھی پھر ضرورت پڑے،
اس وقت کے لوگ مجھے حسبِ خواہش پھر مصلوب کر سکیں۔

خوابِ صُورت

اُس رات میں نے رَسولِ اکرمؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔

وہ ایک کھیت کے کنارے کھڑے، چند کسانوں سے باتیں کر رہے تھے اور کھیت میں لہلہاتے ہوئے خوشوں میں سے شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔

اُن کی شبیہہ ویسی ہی تھی جیسی کہ روزمرّہ کی بات چیت سُن کر ذہن میں محفوظ ہو چکی تھی۔ سر پر بڑا سا سفید عمامہ تھا اور انہوں نے سبز رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

کِسان جب اپنی بات ختم کر چکے تو انکے چہرے پر مسکراہٹ، بجلی کی طرح چمکی۔ کِسانوں نے اپنے ہاتھ پیٹ پر باندھ لئے انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے انہیں کچھ سمجھایا۔ کِسانوں نے حامی بھرنے کے سے انداز میں اپنے سَر ہلائے۔ تب وہ وِداع ہوئے اور آہستہ آہستہ کھیت کی مینڈھ پر چلتے ہوتے آگے بڑھنے لگے۔ پھر انکا سبز عمامہ کھیت کی ہریالی کا حصّہ بن گیا اور وہ کائنات کی وُسعت میں سما گئے۔

تب میں بہت چھوٹا تھا ——

میں نے صُبح اپنی ماں کو اپنا خواب سُنایا —— اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر کہا۔

"واہیگورُو، واہیگورُو!" اور بولی۔ "خوشحالی آنے والی ہے۔"

پھر وہ لپک کر کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چوتھی سیڑھی پر پہنچ کر اس نے پڑوسیوں کی دیوار کے اوپر سے جھانک کر دوسری طرف آواز لگائی۔

"فاطمہ بہن!"

تھوڑی دیر کے بعد میری ماں ہی کی ہم عمر ایک عورت کا چہرہ نمودار ہُوا ——

اُس نے کانوں میں بڑی، بڑی پُچھے دار بالیاں پہن رکھی تھیں اور سر پر سیاہ دوپٹہ تھا۔

"کیا ہے رام پیاری؟" اُس نے سہج سبھاؤ سے پوچھا۔ جیسے اس قسم کا بُلاوا ایک معمول سا ہو — میری ماں نے قدرے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"سُنا تم نے اپنے چھندری کو رات کیا سپنا آیا —!"

"نہیں تو — کیا آیا اَڑیئے؟"

اور میری ماں نے میرا دیکھا ہوا خواب بہن فاطمہ کے گوش گذار کر دیا۔

"اللہ — نہیں!" فاطمہ پوری عقیدت سے بول اٹھی "وہ کہاں ہے نی اَب؟"

"نیچے گلی میں بچّوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔" میری ماں نے بتایا۔

"الٰہی خصمّاں کھانے نے کیا ثواب کما لیا ہے!" فاطمہ کا چہرہ کہتا ہُوا دیوار سے نیچے لڑھک گیا۔

میں گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شٹاپُو کھیل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سب طرف سنّاٹا تھا۔ ایسے وقت میں گھروں کے دروازوں پر بندھی گائیں اور بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ شاید نہر پر نہانے جانے کو اُتاولی ہو رہی تھیں۔ مگر گوُجر ابھی نہیں آیا تھا — ہمارے گھر کے سامنے والے لڑکیوں کے سکول میں ابھی چھٹّی نہیں ہوئی تھی۔

شٹاپو بھی عجیب کھیل ہے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کر کنویں، دریا اور سمندر بنائے جاتے ہیں اور بوٹ پالش کی ایک خالی ڈبیا سے بشارت لیکر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں اب کائنات کے کون سے خطے کو پھلانگنا ہے۔ باری میری تھی اور میں تیسرا دریا پھلانگنے کیلئے پَر تول رہا تھا۔ کہ فاطمہ نے پیچھے سے آکر مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

اللہ کیا ہُوا اوے — ساری بات تو بتا۔ سُبحان اللہ تم پر تو رنگ چڑھا لگتا ہے۔ کیا رتبہ پا لیا ہے۔"

وہ اٹھائے، اٹھائے مجھے اپنے گھر کی طرف لیجا رہی تھی۔ ماں اوپر سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور بچّے سب دم بخود سے کھڑے فکرمند سے ہو گئے تھے۔ کہ کھیل میں

سے اچانک ایک کھلاڑی کے اُٹھ جانے سے وہ سارا کچھ پھر سے کیسے منظم کرپائیں گے۔

فاطمہ کے شوہر شیخ اللہ دتہ، بازار میں مکان کے نیچے بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ لمبے، لمبے بانس تو سائبان تاننے اور مکان وغیرہ بنانے کے کام آتے تھے۔ لیکن چھوٹی لاٹھیاں لوگ بلم اور بھالے بنانے کے لیے لے جاتے تھے جو بعد میں مرنے مارنے کے کام آتی تھیں — فاطمہ نے اُن کو لفظ بھیج دیا تھا — وہ میرے پاجامہ کیلئے لٹھے کا ٹکڑا اور قمیص کیلئے پاپلین، ایک سیر جلیبی اور سوا روپیہ نقد لیکر آپہنچے — فاطمہ نے وہ سب میری جھولی میں ڈالا اور مراقبے میں گر گئی — شیخ اللہ دتہ دونوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ فاطمہ آنسوؤں سے تر آواز میں پھُسپھُسانے لگی۔

"ہمارے رسول، ہمارے رسول!"

شیخ نے حال کی سی کیفیت میں سر کو ایک بار دائیں اور ایک بار بائیں جنبش دے کر سرگوشی کی۔

"آمین... ثم آمین"

شہر کے مرکزی گھنٹہ گھر نے ساڑھے بارہ بجائے۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی۔ گائیں اور بھینسیں رسّیاں کھُلتے ہی نہر کی طرف بھاگیں۔ بچوں کی ایک پارٹی نے دوسری پارٹی کو ایک گیم سے ہرا دیا — جیسے سب طرف حشر سا برپا ہو گیا ہو۔

اس بات کو کئی برس بیت گئے ہیں۔

شہر کے مرکز میں ایستادہ گھنٹہ گھر نے کچھ ضرور بجایا ہوگا۔ لڑکیوں کے سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی ہوگی، گائیں بھینسیں ڈکراتی ہوئی نہر کی طرف بھاگی ہونگی اور زمین پر لکیر در لکیر سے بنے کنویں، دریا اور سمندر بھی پھلانگے جاتے ہونگے — لیکن کوئی آواز نہیں آتی۔

"ماں اب کبھی پھر ویسا خواب نہیں آیا —!" میں نے پوچھا۔

اب کہاں بیٹا — وہ اُدھر رہ گئے۔ ہم یہاں آگئے۔" ماں نے جواب دیا۔

ماں اچانک بیمار پڑ گئیں تھیں۔ بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر نے ایک دن کہا "بہتر ہے کسی سینی ٹوریم میں داخل کروا دو"

کافی دوڑ دھوپ کے بعد اُسگاؤں کے سینی ٹوریم میں جگہ مِل سکی۔ ماں اُس سینی ٹوریم میں ساڑھے تین برس رہیں۔ جس صبح اُسکی موت ہوئی۔ اُس سے پہلی شام مَیں اور میری بیوی اُسکے پاس تھے۔ وہ بالکل بھلی چنگی لگ رہی تھیں۔ چہرے پر چمک تھی۔ آنکھوں کی پتلیوں میں ستارے سے ٹوٹتے دِکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے اُسکے سَر کے چاندی سے سفید بال سنوار کر پیچھے جُوڑا بنا دیا تھا۔ ایسی صحت مند وہ کبھی بھی دِکھائی نہیں دی تھی۔ ہم دونوں شام کی بس سے لوٹ آئے تھے۔ گھر میں بچّے اکیلے تھے۔ اور پھر مارگریٹ نے بھی بڑے تسلّی آمیز لہجہ میں کہا تھا۔

"آپ لوگ جائیے۔ ماں جی بالکل ٹھیک ہیں"

مارگریٹ سینی ٹوریم میں کیئر ٹیکر تھی اور میری راکھی بہن بن گئی تھی۔ ہُوا یوں تھا کہ ایک بار جب مَیں اسیطرح ماں کو دیکھنے آیا تھا تو اتفاق سے اُس دن راکھی کا تیوہار تھا۔ میں بیٹھا ماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ مارگریٹ آئی اور میری کلائی پر راکھی باندھ دی۔ میں بوکھلا سا گیا تھا۔

"ماں جی نے مجھے بیٹی بنا لیا ہے" مارگریٹ نے بتایا۔

ماں تھی ہی ایسی، جہاں جاتی لوگوں کا مَن موہ لیتی تھی۔ مجھے یاد ہے پتاجی مرتے دم تک ماں کے عشق میں مبتلا رہے تھے۔ کئی بار ماں کے رخساروں کو چھو کر اور نظریں اسکے چہرے پر گاڑ کر اُنہیں، میں نے آنسو بہاتے دیکھا تھا۔

پتاجی کہا کرتے تھے "بیٹا مَن میں کبھی تعصّب نہ لاؤ۔ عقیدہ پکّا رکھو۔ جو کچھ پڑھو اُسے بھگوان کے بھیجے ہوئے شبد سمجھو۔ ورنہ کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور نِرے قمرالدین کے قمرالدین رہ جاؤ گے۔" انکی عجیب عادت تھی۔ وہ جس کا نام نہ جانتے یا اُسے جاہل سمجھتے قمرالدین کہہ کر پُکارا کرتے۔ انکی بات زندگی کی کسوٹی پر کئی بار کھری اتری۔ میں نے اکثر دیکھا کہ کوئی قمرالدین اپنے رَٹے ہوئے علم، اونچے قد، لمبی پہنچ اور چہرے پر چپکائی ہوئی چوڑی مسکراہٹ کے بَل بوتے پر کوئی عہدہ پا لیتا ہے۔ مگر اُس کے سر میں بھیجا کتنا ہے۔ کوئی وزن نہیں کرتا۔

مرنے کے بعد ماں کا مُردہ بھاری ہو گیا تھا۔ ہم کو اُس کی موت کی خبر اگلے دن دوپہر کو مل گئی تھی۔ مارگریٹ نے سینی ٹوریم کے ایک کارکن کو ایڈریس دے کر بھیجا تھا۔ میں بیوی بچوں سمیت اُس گاؤں پہنچا۔ مارگریٹ سینی ٹوریم کے مورگ کے دروازے پر سوگوار بیٹھی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے وہ باری باری سب کے گلے لگ کر روئی۔ وہیں اُس گاؤں کے چھوٹے سے شمشان میں ماں کا انتم سنسکار کر دیا۔ اُسکے ساتھ ہی جیسے زندگی کی کتاب کا ایک ادھیائے سماپت ہو گیا۔

اس دن کے بعد اُس گاؤں ہمارے لیئے ایک تیرتھ استھان سا بن گیا۔ ہم ہر راکھی کو وہاں جاتے۔ مارگریٹ مجھے راکھی باندھتی اور پھر ہم سب شمشان میں جا کر بیٹھتے اور ماں کی باتیں کرتے۔ اس دن کے بعد سے مارگریٹ گویا ہمارے خاندان کا ہی ایک فرد بن گئی تھی۔

بس اپنی مخصوص رفتار سے اُس گاؤں کی طرف چلی جا رہی تھی۔ باہر وہی بار ہا دیکھا ہُوا منظر تھا۔

"کُتے کی موت مرے گا سالے" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایک قمرالدین نے دوسرے قمرالدین کو ہنسی کھیل میں گالی دی — میں نے ایک بار پلٹ کر دونوں کو دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر بار ہا دیکھا ہُوا منظر دیکھنے لگا۔

دو متوازی پہاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اُنکی چوٹیوں پر دُھند چھائی ہوئی تھی — مطلع ابر آلود تھا — پہاڑیوں کے دامن میں سُرخ ٹائیلوں کی چھتوں والے کئی مکان دَھرے ہوئے تھے کسی کی کھڑکی کُھلی تھی — کسی کا دروازہ۔ گھروں کے اندر دُھند لٹکا تھا — اندر کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی — ہَوا بوجھل تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں جھکولے کھا رہی تھیں اور فضا میں گیلی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ سب طرف جل تھل تھا — چلتی ہوئی بس بالکل بے حرکت لگ رہی تھی۔

کل راکھی کا تیوہار ہے اور میں اس بار اکیلا ہی مارگریٹ سے راکھی بندھوانے

جا رہا تھا۔

اُسگاؤں دراصل تین حصّوں میں بٹا ہُوا ہے — پہلے حصّہ میں ایک عالیشان مندر ہے جسکے گنبد کا کلش دُور سے ہی دِکھائی دینے لگتا ہے — اُس پر گیرُوے رنگ کا ایک جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ مندر کی عمارت بڑی شاندار اور پختہ ہے — ایک اونچی چار دیواری مندر اور اُسکی عمارت سے ملحقہ گیسٹ ہاؤس کو گھیرے ہوئے ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے تمام کمرے ایر کنڈیشنڈ ہیں۔ جن میں، امریکہ، آسٹریلیا اور یورپ سے آئے ہوئے اُن سوامی جی کے عقیدت مند آکر ٹھہرتے ہیں جن کے نام پر یہ مندر تعمیر ہُوا ہے۔

وہ سوامی جی کون تھے۔ یہ پوری طرح سے کوئی نہیں جانتا۔ ایک پوتر آتما جو ایک دن اِس خطۂ زمین پر آن اُتری، اور پھر یہیں کی ہو گئی — سوامی جی کی تصویریں جا بجا لگی ہوئی دِکھائی دیتی ہیں۔ وہ لنگوٹ باندھے باقی شریر سے بالکل ننگے ہیں۔ ایک ہاتھ اُٹھا کر عجب دیوتاؤں کی سی شان سے بیٹھے ہیں۔ جیسے سارے سنسار کو آشیرواد دے رہے ہوں۔ کسی کسی تصویر میں اُن کے سامنے ایک پھنیر سانپ بھی بیٹھا دِکھائی دیتا ہے۔ جو اُن کی ایشوریہ شکتی کے سامنے گویا نت مستک ہو گیا ہے — مندر کے بڑے ہال کا ماحول بڑا پُراسرار ہے۔ گھرے اندھیرے میں اُنکی سونے سے بنی مورتی چمکتی ہے۔ سوامی جی فربہ شریر کے سیاہ فام منشیہ تھے انکا چہرہ گیند کی طرح گول تھا — مندر میں دن رات تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آرتی ہوتی ہے۔ جسمیں غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند قطاروں میں کھڑے ہو کر آرتی گاتے ہیں۔ ایک بھگت ہارمونیم پر ساتھ دیتا ہے اور لاؤڈ سپیکر سے یہ سُر تال اور لے اوپر آکاش کی وُسعت میں پھیلا دی جاتی ہے — یہ منظر دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ، سرشٹی کی اُتپتی سے ہو رہا ہے۔

مندر ہی کی عمارت میں ایک طرف، ایک بدیشی بنک کی برانچ ہے — سامنے ایک صاف ستھرا ریستوراں ہے۔ جسمیں سے ایک راستہ پیچھے پارک میں جاتا ہے۔ پارک میں کئی پھلدار درخت ہیں اور طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں۔ غیر ملکی اور مقامی عقیدت مند یہاں فرصت کے وقت میزوں کے گرد بیٹھ کر چائے کافی

پیتے ہیں اور گپ شپ لڑاتے ہیں۔

ریستوراں کے ساتھ ہی مندر کے نام پر بنا پوسٹ آفس ہے — جس کے باہر بس سٹینڈ کا شیڈ ہے — پختہ سڑک کے ایک طرف چند دُکانیں ہیں۔ جن میں ایک لانڈری اور ایک پرویژن سٹور ہے — اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی دُکانیں — مندر سے بہت فاصلہ پر مین روڈ کے کنارے بنے ایک مکان میں ولایتی شراب کی دُکان ہے — آرتی کے سُر فضا میں گونجتے رہتے ہیں — اور سڑک پر خاصی چہل پہل رہتی ہے۔

اُسگاؤں کے دُوسرے حصّہ میں سینی ٹوریم ہے۔

متعدی بیماریوں کے مریض بوڑھے اور بوڑھیاں۔ شہر کی دُھول مٹی اور کارخانوں کی زہریلی ہواؤں سے دُور۔ خریدی ہوئی سانسیں، سینی ٹوریم میں لیتے ہوئے ادھر اُدھر ٹہلتے ہیں یا پھر سردیوں کی دھوپ میں آرام کرسیاں ڈال کر چہروں پر ہاتھ رکھے آسمان کی طرف دیکھتے بیٹھے نظر آتے ہیں — اسی علاقہ میں گندھک کے پانی کے چشمے ہیں — تیراکی کا لباس پہنے غیر ملکی عقیدت مند اور شہر سے آئے ہوئے مرد عورتیں اپنے کندھوں پر تولیے ڈالے اُن چشموں کی طرف جاتے اور آتے رہتے ہیں۔

اگر مندر والے حصّہ میں آتمک شُدھی کی کریا چلتی رہتی ہے۔ تو اس حصّہ میں شریر کو نروگ رکھنے یا کرنے کی کوشش جاری رہتی ہے دونوں حصوں میں چہل پہل ہے۔ لوگ روپیہ خرچ کر کے روحانی اور جسمانی زندگی جی رہے ہیں۔ مارگریٹ کا گھر اسی حصّہ میں سینی ٹوریم کے پچھواڑے واقعہ ہے۔

ہم لوگ یہاں آئیں تو مارگریٹ کے گھر ہی ٹھہرتے ہیں — وہ شہر آئے تو ہمارے ہاں رہتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا نا — کہ ہم قریب قریب ایک ہی خاندان کے فرد ہو گئے ہیں۔

اور اُسگاؤں کا تیسرا حصّہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے —

صدیوں پہلے یہ گاؤں بسا ہوگا — کئی بار اِس گاؤں کے گھروں کے

چھپّر آندھی میں اُڑ گئے ہونگے اور پھر سیاہی مائل ہاتھوں نے نئے گھر تعمیر کئے ہوں گے۔ اِن گھروں کے گرد پھیلے ہوئے کھیت کروڑوں برس پُرانے ہیں ـــــ اور اِس گاؤں کے اس حصّہ کے گاؤں میں بسنے والوں نے ان کھیتوں سے لاکھوں بار اپنے مقدّر کی فصل کاٹی ہوگی ـــــ وہ سب جو اِن گھروں میں رہتے ہیں۔ اَدھ ننگے ہیں ـــــ اُنکے جسم دُھوپ کی تمازت کی وجہ سے کالے ہوگئے ہیں ـــــ اُنکی عورتوں کی چھاتیاں درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی طرح لٹکتی رہتی ہیں۔ اُن کے کانوں میں کئی چھید ہیں جن میں چھوٹی بڑی چاندی کی بالیاں جھولتی ہیں۔ اُن کے گھر اندھیرے ہیں اور انکی عورتیں پینے کے لئے دُور گندے تالابوں سے پانی کے مٹکے بھر بھر کر لاتی ہیں۔

اُس گاؤں کے مندر والے حصّہ اور اس حصّہ میں کئی صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ایک پکّی سڑک اُس طرف سے اِس طرف آتی ہے جو یہاں پہنچ کر کسی کھیت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اَن گنت پگڈنڈیاں شروع ہوتی ہیں جو کہیں گھروں کے آگے سے اور کہیں کھیتوں کے درمیان میں سے گذرتی ہوئی نامعلوم اطراف میں بکھر جاتی ہیں۔

ایک بار جب میں یہاں آیا تو یونہی گھومتا پھرتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا ـــــ جہاں مجھے وہ کھیت نظر آیا جس کے خوشوں میں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں ـــــ جس کے کنارے چند کسانوں کو میں نے اُن سے باتیں کرتے دیکھا تھا ـــــ

"اوہ تو بچپن کے اُس خواب کا کھیت یہاں واقع ہے!"

میں نے مَن ہی مَن کہا اور کافی دیر کھڑا وہاں انتظار کرتا رہا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ سب طرف سناٹا تھا ـــــ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گذرتی تھی ـــــ اور کبھی کبھی کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہ آیا ـــــ کھیتوں میں ہریالی لہلہاتی رہی۔

بس سٹینڈ پر اُتر کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور مارگریٹ کے گھر کی طرف چل دیا ـــــ میں اب اِن راستوں سے بخوبی واقف ہوں۔ آنکھیں بند کر کے بھی

پہنچ سکتا ہوں — راستہ میں ایک جگہ میں نے ایک بھیڑ دیکھی — چند کاریں اور پولیس کی گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ سفید اُجلے لباسوں میں کچھ لوگ بڑے مصروف نظر آئے — میدان میں ایک سائبان تنا ہُوا تھا — جسکا رنگ برنگا کپڑا ہُوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ سائبان کے اندر رنگیلے کاغذ کی جھنڈیاں لگی تھیں — ایک طرف ایک بڑی میز اور کرسیاں پڑی تھیں — میں یہ نظارہ دیکھنے کیلئے رُک گیا — قریب گیا تو دیکھا کہ سائبان کے نیچے وسط میں ایک ہینڈ پمپ لگا ہُوا تھا۔ جسکے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ قریب ہی ایک ہَون کُنڈ پر جوت جل رہی تھا — جسکے ایک طرف اوپر کے دھڑ سے ننگا ایک براہمن پوجا کر وا رہا تھا — معلوم ہُوا کہ علاقہ کے وزیر صاحب آئے ہیں۔ گاؤں والوں کے لئے پینے کے پانی کی سہولت کیلئے ہینڈ پمپ کا اُدگھاٹن ہونے جا رہا ہے۔

ہَون کُنڈ میں سامگری جل رہی تھی۔ فضا میں منتر گونج رہے تھے — منتر جب ایک خاص مرحلہ پر پہنچتا تو سب ہَون کُنڈ میں سامگری ڈالتے وزیر صاحب بھی — جن کے گلے میں بھی ایک ویسا ہی پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ جیسا کہ پمپ کے گلے میں۔

پوجا ختم ہوئی تو وزیر صاحب نے ناریل پھوڑا — سب نے وزیر صاحب کی جے کا نعرہ لگایا اور تالیاں بجائیں — وزیر صاحب نے ہینڈ پمپ کا ہتھا پکڑ کر دبایا — پمپ کے دہانے سے پانی اُبل پڑا — وہ پہلا پانی ایک برتن میں لیا گیا اور پھر چرن امرت کی طرح سب میں بانٹا گیا — سب نے چُلّو میں لیے پانی کو منہ لگایا اور پھر ہاتھ اوپر اُٹھا کر اپنے سر کے بالوں سے پونچھ دیئے۔

میں نے مارگریٹ کو دیر سے گھر پہنچنے کی وجہ بتائی۔ تو اُس نے کہا۔

"ہاں بیچارے گاؤں والوں کو پینے کے پانی کی بہت تکلیف ہے۔ گندے تالابوں کا پانی پیتے ہیں۔ بہت اچھا ہُوا۔"

پروگرام یہ طے پایا کہ میں صبح راکھی بندھوا کر پہلی بس سے نکل جاؤں گا — شہر کو جانے والی پہلی بس صبح ساڑھے آٹھ بجے جاتی تھی۔

مارگریٹ آخری راؤنڈ لگانے کیلئے سینی ٹوریم گئی۔ میں یونہی ستانے

کیلئے اُس کے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی ـــ

مارگریٹ نے واپس آ کر جب مجھے جگایا تو رات ہو چکی تھی اور کھانا میز پر لگا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا ـــ مارگریٹ نے کہا۔ کہ میں اُس کمرے میں اُس کے پلنگ پر ہی سو جاؤں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کھانے کا خمار اور پھر بس میں بیٹھے رہنے کی تھکاوٹ کی وجہ سے پڑتے ہی سو گیا ـــ

پھر ایک عجیب خوابناک فضا قایم ہونے لگی ـــ بچپن میں دیکھا ہُوا خواب، فاطمہ کا لَش لَش کرتا چہرہ ـــ ماں کی جلتی ہوئی چِتا اور پھر کئی جانے انجانے چہرے اس طرح میرے گرد منڈلانے لگے جیسے دھاگوں سے باندھ کر چھت سے لٹکا دیئے گئے ہوں ـــ میں چاہ رہا تھا کہ بچپن میں دیکھے ہوئے خواب کی طرح ایک بار پھر دیدار ہو جائیں ـــ لیکن لگتا تھا ـــ اُس نظارے کو کسی نے نظر بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے حواس کے جنگل سے نِکل کر کسی دوسری دُنیا میں جا پہنچا ـــ

میرے نتھنوں میں کسی جسم کی مہک بَس گئی ـــ اور اچانک ایسا ہُوا کہ میں نیند کا تار و پود توڑ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔

"یہ میں نے کیا کیا ـــ ؟" میں بڑبڑایا۔ جواب یہ تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا بَس، کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا یا دیکھا وہ عمل انتہائی شرمناک تھا۔ میں اُس کے لیے اپنے ہی سامنے نادم ہو رہا تھا۔ جہالت کے جنگل سے تہذیب کی وادی تک کے سفر کے باوجود میرا ذہن روشن نہیں ہُوا تھا ـــ کمرہ بالکل اندھیرا تھا۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر دیکھا ساڑھے تین بجے تھے۔

اُس شرمناک عمل نے میرے تمام حواس معطّل کر دئے تھے۔ ذہن قریب، قریب ماؤف تھا ـــ اور کنپٹیوں پر ہتھوڑے برَس رہے تھے۔ میں نے لائیٹ جلائی۔ سگریٹ سُلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ہے بھگوان یہ سب کیسے ہو گیا ـــ ؟" مَیں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

مجھے کسی کل چین نہیں تھا ــــ میں نے خواب میں مارگریٹ کے ساتھ مُباشرت کی تھی۔
صُبح میں بہت جلد تیار ہو گیا ـــ مارگریٹ آئی اور اُس نے میری کلائی پر راکھی باندھی۔ میرے مونہہ میں مٹھائی کا ٹکڑا ڈالا۔ میں نے اُسے ایک سو ایک روپیہ دیا ـــ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ یہ سارا کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔ میں نے چلنے کیلئے بیگ اُٹھایا۔

"اتنی جلدی!" مارگریٹ نے کہا۔

"آہستہ آہستہ نکل جاؤنگا ـــ تمہیں بھی تو ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

چلتے چلتے میں اُس کھیت تک پہنچا ـــ جس کے خوشوں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ کافی دیر وہاں کھڑا رہا ـــ سوچا شاید کچھ طہارت نصیب ہو ـــ وہاں کوئی دکھائی نہ دیا ـــ "میں کس کا منتظر ہوں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ـــ اس بار مجھے کوئی جواب نہ مِلا ـــ پہاڑی کے پیچھے سے سورج دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا ـــ کھیت کے کِنارے کوئی نہیں تھا۔

میں چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھنے لگا ـــ پھر اس مقام پر پہنچ گیا ـــ جہاں کل سائبان تنا ہُوا تھا۔ اب سائبان غائب تھا ہون کُنڈ ٹھنڈا پڑا تھا۔ پُوجا کا سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا ـــ ہینڈ پمپ کے گلے میں پڑا پھولوں کا ہار مُرجھا گیا تھا۔
گاؤں کی طرف سے ایک آدھ ننگی سیاہ فام عورت سر پر مٹّی کا مٹکا رکھے آرہی تھی۔ اُسکے کانوں میں چاندی کی بالیاں جھول رہی تھیں۔ پیشانی پر ٹاٹو سے کچھ شبیہہ بنی تھی۔ اُسکے بال اُوپر سے بکھرے ہوئے تھے ـــ اور پیچھے جُوڑا بنا ہُوا تھا۔ وہ سیدھی پمپ کی طرف بڑھ رہی تھی

میں نے سوچا یہ پہلی عورت ہے جو اس ہینڈ پمپ کا پانی۔ پینے کیلئے اپنے گھر لیجائے گی ـــ میں ہینڈ پمپ کے مُنہ سے پہلا پانی نکلنے کا منظر دیکھنے کیلئے رُک گیا۔
عورت پمپ کے قریب آئی ـــ اُس نے اپنا مٹکا زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جُھکا کر ہینڈ پمپ کو پرنام کیا ـــ پھر وہ سیدھی ہوئی ـــ اس نے اپنا مٹکا

اُٹھاکر دوبارہ سر پر رکھا اور اُس سمت بڑھنے لگی جدھر گندے پانی کا وہ تالاب تھا، جسمیں سے وہ ہر روز پینے کے لئے پانی لیجایا کرتی تھی ۔

جمغورۂ الفریم : دو

جمغورہ الفریم اُداس اور ویران ہے۔ اُس کے
فرش پر ایک لاش رکھی ہے، جس کا انگ انگ کٹا
ہُوا ہے اور خون کے دھبّوں سے سارا فرش
سیاہی مائل ہو گیا ہے ـــــ مُردہ جسم کے کئی حصّے
غائب ہیں۔ پرانی کتابیں جو میز پر رکھی ہیں، اُن میں
سے ایک کتاب (جسے ابھی دیمک نے چٹ نہیں
کیا ہے) میں لکھا ہے کہ کھڑکی کے نیچے فوارے کے
پاس بیٹھی خارش زدہ کُتیا نے میرے جسم کے کئی
حصّے بھنبھوڑ کر کھا لیے ہیں ـــ اور ابھی اور حصّے ملنے
کی امید میں بیٹھی کان کُھجا رہی ہے ـــــ (۱۹۷۱ء)

میں، حامد مرزا اور پربل کُمار ایک عرصہ سے خاموش بیٹھے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ اچانک گرجا گھر کا گھڑیال بج اُٹھتا ہے۔ ہم یکبارگی چونکتے ہیں۔ ہماری نظریں غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے چہرہ پر اُٹھ جاتی ہیں۔ بظاہر ہم تینوں کے چہرے بالکل سپاٹ ہیں ـــ لیکن ہم تینوں جانتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک مدوجزر اُٹھ رہا ہے ـــ گرجا گھر کے گھڑیال کی آواز ہم تینوں کے لیے ایک اشارہ ہے ـــ کہ زیرِ غور مسئلہ کا تعلق گرجا گھر کے پچھواڑے بنے کنویں سے ہے۔ مسئلہ اُتنا ہی پُرانا ہے۔ جتنا کہ گرجا گھر اور پھر اُس کے پچھواڑے بنا کنواں ـــ یعنی، اگر گرجا گھر کی تعمیر کو دو ہزار برس گذر چکے ہیں تو

اُس کے پچھواڑے بنا کنواں دو ہزار ایک برس پُرانا ہے ۔۔۔ چوں کہ ہم نے مان لیا ہے کہ ہماری زندگیوں میں گرجا گھر کی عمارت سب سے پرانی ہے ۔ تو اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں ایک ہی برس کافی ہے ۔ اَب یہ الگ معاملہ ہے کہ ہمارا تعلق اُس ایک برس سے ہے یا دو ہزار ایک برس سے ۔۔۔ اور مسئلہ وہ کنواں ہے جو گرجا گھر کی تعمیر سے پہلے کھُدا ہُوا تھا ۔

پَربل کُمار نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ کنواں دَلدل سے بھرا ہُوا ہے ۔۔۔ نہ کوئی اُسمیں جا سکتا ہے اور نہ ہی اسمیں سے کچھ برآمد ہو سکتا ہے ۔۔۔ حامد مرزا اُن دنوں غیر خانگی معاملات میں بُری طرح مصروف تھا ۔۔۔ یہ بات ہم نے ایک کان سنی اور دوسرے کان نکال دی ۔۔۔ لیکن جب حامد مرزا غیر خانگی معاملات سے نپٹ چکا اور میں اقلیدس کے سوال حل کر چکا تو ایک دن حامد مرزا نے دبی زبان سے کہا ۔۔۔ "کیوں نو تیج تم نے پَربل کُمار کی بات پر یقین کر لیا ۔۔۔ ؟"

"کون سی بات ؟" مَیں نے لاپرواہی سے پوچھا تھا ۔

"وہی ۔۔۔ گرجا گھر کے پچھواڑے بنے کنویں کے دَلدل سے اٹے ہونے کی بات ۔"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ ؟"

"عجیب آدمی ہو ۔۔۔ اپنے سرمائے میں سے دو ہزار سال دے کر جو ایک سال بچا ہے اُس سے اِتنی بے اعتنائی برت رہے ہو ۔۔۔"

تب اچانک مجھے احساس ہُوا کہ حامد مرزا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ اور اُسی وقت یہ بھی لگا تھا کہ سب لُٹ چُکا ہے ۔ اور دلدل سے اَٹا ہُوا کنواں ہماری زندگیوں میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

"لیکن پربل کمار نے کیسے کہہ دیا کہ کنواں دَلدل سے اَٹا ہُوا ہے ؟" مَیں نے حامد مرزا سے سوال کیا تھا ۔

"یہی تو مَیں کہہ رہا ہوں ۔۔۔ ہمیں اتنی جلدی اُس کی بات پر یقین نہیں

کر لینا چاہیئے تھا ــــ ہمیں خود جا کر دیکھنا چاہیئے تھا۔" حامد مرزا بولا تھا۔

لہٰذا میں، حامد مرزا اور پربل کمار پچھلی رات، چہل قدمی کا بہانہ کرتے ہوئے ــــ گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ بات بڑی عجیب لگی کہ اپنے سرمائے میں سے دو ہزار برس کی قربانی دے دینے کے باوجود جب ہم اپنے ایک برس کی طرف بڑھنے لگتے ہیں تو چوروں کی طرح دبے پاؤں جانا پڑتا ہے۔ رات کے اندھیرے سے مدد لینا پڑتی ہے اور اپنے اندر چھپے ارادے کے خطرناک نہ ثابت ہونے کی دعائیں مانگنا پڑتی ہیں۔

وہ رات کا شاید دوسرا پہر تھا، جب یہ سب ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ اپنے چبوترے پر، آسمان کی طرف دایاں ہاتھ اٹھائے کھڑا عیسٰیؑ، نیچے اترا اور مریم کی مورتی کی طرف بڑھا۔ مریم نے بڑی احتیاط سے ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جھک کر اپنے ہونٹ عیسٰیؑ کی پیشانی پر ثبت کر دیئے ــــ قریب کھڑی بھیڑ کے تھنوں سے دودھ بہنے لگا اور سامنے رکھی گھاس میں سے ہزاروں جگنوں نکل کر فضا میں اِدھر اُدھر پھیل گئے ــــ گرجا گھر کا گھڑیال بالکل ٹھہرا چکا تھا ــــ جھاڑوں اور جھاڑیوں میں چھپے پرندے بالکل ساکت تھے ــــ اور ہم قریب، قریب کنوئیں کے قریب تھے ــــ اور خطرے سے بالکل دوچار ــــ کہ جغورہ الفریم لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ــــ بات بالکل صاف ہے، کہ ہم دو ہزار سے نقسیم ہوئے بیٹھے ہیں اور ہمارے پاس صرف ایک برس بچا ہے ــــ ہماری پوری کائنات کہ ہم جس پہ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور پربل کمار کے کہنے کے مطابق وہ دلدل سے اٹا ہوا ہے۔

ہم تینوں کے قریب سے ایک آدمی گذرا ــــ اُس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی، اندھیرے میں اُس کا سفید لباس صاف دکھائی دے رہا تھا اور اُس لباس میں سے وہ آدمی گویا غائب تھا ــــ وہ سیدھا کنوئیں کی طرف بڑھا تھا ــــ ہم ذرا ٹھٹھک گئے ــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُچک کر کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ اور منڈیر کے دائرے پر چلتا ہوا کنوئیں میں اُترنے لگا ــــ جیسے کنوئیں کے اندر دیوار کے ساتھ، ساتھ سیڑھیاں بنی ہوں۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں پر دیکھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے ہم اپنی حیرانی ایک دوسرے کو پاس آن، کرنا چاہتے تھے۔

"اب سنو پربل کمار — اگر کنواں دلدل سے اٹا ہوا تھا — تو وہ آدمی کہاں غائب ہو گیا؟ — اور سوال یہ بھی ہے کہ وہ آدمی کون تھا —؟" حامد مرزا نے اچانک پوچھا۔ گرجا گھر کا گھڑیال بدستور خاموش تھا۔ میری نظریں بھی پربل کمار کے چہرے پر ٹکی تھیں — اور پربل کمار کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمنے لگی تھیں — جب پربل کمار نے بولنے کے لیے منہ کھولا، تو لگا کہ، اُس کے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کے چٹخنے کی آواز آئی ہے۔ اُس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں —"

"تو پھر ہم وہ کنواں دن کے اُجالے میں کیوں نہیں دیکھ سکتے —؟" حامد مرزا نے پوچھا۔

"تو ہمیں مان لینا ہو گا — کہ ہمارا اِس کنویں سے کوئی رشتہ ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں — دو ہزار ایک برس پُرانا رشتہ۔" حامد مرزا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں — ایک برس پُرانا رشتہ — دو ہزار پر ہم تقسیم ہو چکے ہیں — اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" پربل کمار چیخا پھر کہنے لگا "ہمیں وہاں دِن کے اُجالے میں جانا ہی ہو گا — اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں — تُم لوگ ٹھیک کہتے ہو —"

چائے کا بِل ادا کر دیا گیا ہے۔

"لیکن جناب آپ کا قیام کہاں پر ہے؟"

"یہیں . . . سامنے . . . . گرجا گھر کے پچھواڑے کنواں ہے نا . . . ."

ہم تینوں پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ دو آدمی باتیں کرتے ہوتے داخل ہوئے ہیں — ایک فربہ سا ٹھگنے قد کا ہے۔ اور اُس کے چہرے پر مستقل بشاشت کے تاثرات ہیں۔ دوسرا سفید لباس پہنے ہوئے۔ اور اچانک ہم تینوں کو لگتا ہے کہ وہ صرف لباس ہے اور وہ خود اُس لباس میں سے غائب ہے۔

ہم تینوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم بجلی کے تار سے چھُو گئے ہیں۔

"حامد مرزا! " مَیں کہتا ہوں۔

"تُو؟ تیج! " حامد مرزا بڑبڑاتا ہے اور پربل کمار کے ہونٹوں کی پیپڑیاں تڑخنے لگتی ہیں۔

گرجا گھر کے پچھواڑے دو ہزار ایک برس پُرانا کنواں تھا ـــــ اُس کی منڈیر سے آگے شہر کا احاطہ ختم ہو جاتا تھا ـــــ پھر میلوں میل پھیلا ہُوا جنگل تھا۔ جس میں بڑی بڑی محراب دار عمارتوں کے کھنڈر تھے۔ اور جگہ جگہ پُرانی ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بکھری ہوئی تھیں ـــــ یہ منظر ہم بارہا دیکھ، سُن اور پڑھ چکے تھے ـــــ تب یہ آدمی کہاں رہتا ہو گا ـــــ؟ کہیں یہ وہی تو نہیں جو کل رات اُچک کر کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا تھا اور پھر دائرے کی شکل میں چلتا ہُوا . . . .

ہم تینوں کی سوچ یک زبان ہے۔ ہم پھر پلٹ کر اندر آ بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی جس طرح کوئی آدمی باہر جانے کے ارادے سے اٹھے اور پھر یہ دیکھ کر کہ باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ ایک گہری سانس لے اور اندر آ بیٹھے ـــــ

ہم تینوں اُن دونوں کے ساتھ والی میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوبارہ چائے منگوائی جاتی ہے اور بغور اُن دونوں کے چہروں پر دیکھنے لگے ہیں ـــــ اب ہم نے ایک عجیب بات محسوس کی ہے ـــــ کہ جس شخص کو ہم صرف لباس سمجھ رہے تھے۔ وہ اچھا خاصہ خوبصورت، دراز قد آدمی ہے۔ اُس نے جو قمیض پہن رکھی ہے اُس کا دایاں بازو کندھے ہی سے نکلتا ہے مگر بایاں بازو کمر سے تھوڑا اُوپر پسلی سے نکل رہا ہے اور اس میں سے اُسکا ہاتھ کسی بچھڑے کی تھوتھنی کی طرح باہر کو نکلا ہُوا ہے۔ جو دائیں ہاتھ سے ماپ میں بڑا ہے۔

ہم تینوں کو ایک ساتھ حیرت ہوتی ہے۔

"اور آپ کا اسم گرامی ـــــ؟" فربہ اور ٹھِگنے آدمی نے، جس کے چہرے پر بشاشت پھیلی ہوئی تھی ایک اور سوال کیا ہے۔

"تلقارمُس" اُس شخص نے جسے ہم محض لباس سمجھ رہے تھے۔ اور

جو دراصل اچھا خاصہ خوبصورت دراز قد آدمی تھا۔) جواب دیا ہے۔

فربہ آدمی حیران سا ہوتا ہے اور ہم بھی ——"یہ نام ۔ ۔ ! یہ نام ۔ ۔ ۔ ! جناب مَیں کچھ سمجھا نہیں ۔ ۔ ۔ یہ کیسا نام ہے ؟"

"یہ خوابوں کی خاموش آوازوں کا ثمر ہے۔" تَلقَارمَس جواب دیتا ہے۔

مَیں، حامد مرزا اور پربل کمار سوچنے لگتے ہیں —— کہ ہم یہ نام پہلے سُن چکے ہیں۔ شاید اِس شخص سے پہلے مل بھی چکے ہیں۔

"کہاں سنا تھا۔؟" ہم میں سے ایک نے سوال کیا ہے۔

"شاید کسی اَمل آوازوں کی بُھول بُھلیاں میں بھٹکتے یہ نام بار بار ہمارے کانوں سے ٹکراتا تھا۔" ہم میں سے دوسرے نے جواب دیا ہے۔

"کہاں دیکھا تھا —— ؟" ہم میں سے تیسرا پوچھتا ہے۔

"شاید ایک دیرینہ داستان کی منہدم دیوار کے مَلبے میں بے سر پاؤں کا کوئی شخص تھا۔ جو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے پتھروں پر کچھ کندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" ہم میں سے کسی ایک نے جواب دیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فربہ ٹھگنے آدمی کے چہرے پر سے بشاشت کی جھلّی ایکا ایکی اُتر گئی ہے۔ اور وہ انتہائی خوفزدہ چہرے میں بدلا ہُوا ایک وجود بن کر رہ گیا ہے —— اور پھر اُس کا وجود پگھل کر ایک چیخ میں ڈھلنے لگا ہے اور اس سے بیشتر کہ وہ چیخ آواز کے قالب میں داخل ہو —— وہ نظروں سے اَوجھل ہو جاتا ہے —— اور تلقارمَس اکیلا بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا ہے۔ جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں ہے۔

یہ بے حِسی کیسی ہے —— کہ ہم ایک واردات میں سے گذر جاتے ہیں۔ زندگی پر سے ایک سانحہ گذر جاتا ہے —— جو ہمارے حواس کو زخمی کر ڈالتا ہے اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی —— ہم آنکھیں بند کیے —— چائے کی پیالی میں سے اُٹھنے والے دھوئیں کو اپنی ناک کی نوک پر محسوس کرتے ہیں اور اُس کی خوشبو کو نتھنوں سے سونگھتے ہیں اور چائے کو گھونٹ گھونٹ پی جاتے ہیں۔ اور جب سر اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو مطلع صاف ہوتا ہے۔ بالکل صاف ——

جیسے میدانِ کارزار میں سے لاشیں اٹھالی گئی ہوں ۔ ۶

یہ کون بولا ہے — ؟ — ہم میں سے تو کوئی نہیں بولا — ! ہم میں سے تو کوئی بولنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا ! ” — ہم تینوں بولتے ہیں —

اور ہم دیکھتے ہیں کہ تلقارمَس اکیلا بیٹھا چائے پی رہا ہے ۔ اور اُس کی پسلی میں سے نکلتے ہوئے قمیض کے بازو میں سے بچھڑے کی تھوتھنی جیسا نکلا ہوا اُس کا بڑا سا ہاتھ ہِل رہا ہے — جیسے اشارے سے ہمیں بلا رہا ہو —

اچانک ہمارے لئے اُسکے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ پھیل رہی ہے ۔ پھر وہ چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھتے ہوئے اُٹھتا ہے اور کونٹر پر پیسے دے کر باہر نکل جاتا ہے ۔

ہم بے اختیار اُس کے پیچھے لپکتے ہیں ۔

فربہ آدمی ایک پیڑ کے نیچے یوں کھڑا ہے ۔ جیسے جوتے پالش کروا رہا ہو ۔ وہ تلقارمس کی طرف بالکل کوئی توجہ نہیں دیتا ہے ۔ تلقارمَس — اُس کے قریب رُک کر کچھ کہتا ہے — جیسے جیب سے پیسے نکال کر جوتہ پالش کرنے والے چھوکرے کو دیتے ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے — فربہ آدمی بدستور وہیں کھڑا رہتا ہے — شاید اُس کا جوتہ ابھی پالش نہیں ہوا ہے ۔

ہمیں لگتا ہے جیسے ہم تلقارمس کا پیچھا کر رہے ہیں ۔
وہ گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہو جاتا ہے —

مستقبل — حال — اور ماضی ...... دو ہزار پر تقسیم شدہ دو ہزار ایک
” کمرے میں پُرانے زمانے کی ایک قندیل
روشن ہو چکی تھی ۔ اُس کی روشنی میں ، مَیں
نے میز پر پڑی ایک کتاب اُٹھا کر کھولی
اور بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا —

لکھا تھا — "پربتوں پر دیودار اور چیڑ کے
اونچے پیڑ ہیں، پگھلی ہوئی برف کے جھرنے
ہیں، ماؤں کی گودیں ہریالی سے بھری ہیں،
میدانوں میں اَن گنت مکان ہیں، ریگستان
میں بکھرے ہوئے ذرّے، سورج کی روشنی
میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں، ساگر اُچھل کر
ساحل پر بچھ جاتا ہے، گھونگے، سیپیاں اور
مچھلیاں ایک دوسرے کی باہوں میں
باہیں ڈالے ناچ کرتی ہیں۔" کُتیا کا
بھونکتے، بھونکتے گلا بیٹھ گیا تھا — کرسی
پر بیٹھی لاش نے کہا — "میرا ایک ٹکڑا کُتیا
کی طرف پھینک دو، وہ شانت ہو جائے گی
ڈرو نہیں۔ جو بھی یہاں آیا، اُس نے ایسا
ہی کیا۔ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ورنہ
کُتیا بھونک، بھونک کر پورا جنگل جگا دے
گی —" میں حیرت سے لاش کے چہرے
کی طرف دیکھتا رہا اور کُتیا کو بھونکتے ہوئے
سنتا رہا۔ کتاب بند کر کے میں نے دوبارہ
میز پر رکھ دی اور لاش کی طرف ندیدوں
کی طرح دیکھنے لگا — گوشت کا ٹکڑا کھاتے
ہوئے کُتیا بالکل اس میں کھوئی ہوئی تھی
— اتنے میں سویرا ہو گیا۔ لاش فرش پر
چیت پڑی تھی۔ اُس کے جسم کا جہاں سے

نیا ٹکڑا نکالا گیا تھا ــــ وہ جگہ ابھی سُرخ تھی:۔ ۱۹۷۱ء

ہم تینوں نے مَن ہی مَن کچھ ٹھان لی ہے ــــ اور گرجا گھر کا گھڑیاں بجنے کی آواز کا انتظار کیے بغیر ہم دبے پاؤں اُس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں ــــ

وہ آہستہ، آہستہ چلتا ہُوا، اچانک اپنی رفتار تیز کر لیتا ہے۔ اور گرجا گھر کی عمارت کے گرد گھُوم کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ــــ

ہم بھی رفتار تیز کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جیسے ہی ہم گرجا گھر کی عمارت کے گرد گھوم کر کنوئیں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگتے ہیں۔ وہ ہمیں کنوئیں کی منڈیر پر چلتا ہُوا دکھائی دیتا ہے ــــ اِس سے پیشتر کہ ہم کنوئیں تک پہنچیں وہ نظروں سے اُوجھل ہو جاتا ہے۔

"کیا وہ کنوئیں میں اُتر گیا ہے۔؟"

"شاید"

"لیکن کنواں تو بقول پربل کمار . . . ."

"خود دیکھ لیتے ہیں۔ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ پربل کمار آخر انسان ہی تو ہے۔"

ہم تینوں کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ جاتے ہیں اور نیچے کنوئیں میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ اور ہماری حیرانی کی حد نہیں رہتی کہ کنواں بالکل عام کنوؤں کی طرح تھا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ کنوئیں میں بہت نیچے سکون سے لہراتے پانی میں چاند کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ اور کنوئیں کی دیوار کے ساتھ، ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ــــ جو نیچے تک اُترتی چلی گئی تھیں مگر تلقارمَس تو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہم تینوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگتے ہیں۔

"لیکن یہ سُنی سنائی بات نہیں۔ آنکھوں دیکھی ہے کہ یہ کنواں دَلدَل سے اَٹا ہُوا تھا۔" پربل کمار جلدی سے کہتا ہے۔

"لیکن دیکھ لو ــــ بتاؤ وہ دَلدَل کہاں ہے؟" حامد مرزا کہتا ہے۔

پربل کمار خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اچانک کنوئیں میں سے کسی کے ہنسنے

کی آواز آتی ہے۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہاتھ کنویں میں سے نکل کر اُس کی منڈیر کے کنارے، کنارے ٹٹولنے کے سے انداز میں چلنے لگتا ہے۔ اور اُس ہاتھ کی شکل بالکل بچھڑے کی تھوتھنی جیسی ہے ـــ اور اُس کے پیچھے ایک بہت لمبا بازو ہے۔ جو کنویں کے تل میں سے اُٹھ کر اوپر تک ـــ پہنچ گیا ہے اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہہ سُن سکیں کنویں میں سے آواز آتی ہے،

"میں آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں ـــ . . . . میں یعنی تلقارمس . . . .

ہم کچھ دیر پہلے ملے تھے . . . . ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا ـــ ہمارا رشتہ بہت پُرانا ہے . . . یعنی دو ہزار ایک برس . . . ."

ہم تینوں بے اختیار آگے بڑھتے ہیں اور غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ اُس بڑے سے ہاتھ کی گرفت میں چلے جاتے ہیں۔ پھر جیسے کوئی غیر مرئی طاقت ہمیں کنویں کی طرف کھینچ لیتی ہے اور ہم ایک، ایک سیڑھی نیچے اُترنے لگتے ہیں۔ اچانک ہمارے نتھنے کسی عجیب سی بُو سے بھر جاتے ہیں۔ اور ہمارے ذہن ماؤف ہونے لگتے ہیں۔

وہ ہمارے آگے، آگے چل رہا تھا ـــ جنگل بہت گھنا تھا ـــ اُس نے اپنا لمبا بازو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اور حسبِ معمول اُس کا بچھڑے کی تھوتھنی جیسا ہاتھ قمیص کے اُس بازو میں سے باہر نکل آیا جو اُس کی پسلی کے قریب بنا ہُوا تھا۔

اُس نے ہمیں سب بتا دیا تھا، سب سمجھا دیا تھا ـــ اس کنویں کی اصلیت اور جنگل تک پہنچنے کا راستہ اور جنگل کی زمین گیلی ہونے کی وجہ ـــ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ابھی ہم موسم کا اندازہ نہ لگا سکیں گے ـــ لیکن اپنے بارے میں وہ کچھ کہنے سے ہچکچاتا تھا۔

اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے ـــ دُور، بہت دُور کھنڈر بکھرے ہوئے تھے اور پتھریلی محرابیں فاحشہ عورتوں کی طرح سینہ تانے کھڑی تھیں ـــ

لیکن ایکا ایکی ہم نے وقت کی دہلیز پار کر لی اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہمیں پیشوں میں بانٹا جا رہا تھا ـــ اور ہم نے دیکھا تلقارمس دو ہزار ایک برس پہلے کا لباس پہنے اپنا لمبا بازو لہرا، لہرا کر ہمیں سمجھا رہا تھا۔ کہ ہمارے سیاسی حقوق کیا ہوں گے؟ ـــ

وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا — اور منظر اُس شہر کی تعمیر سے پہلے کا تھا۔ جس کے کھنڈروں کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔

میں، حامد مرزا اور پربل کمار — تینوں بے نام اکائیوں کی طرح اُس امبوہ میں کھڑے تھے۔ جو میدان میں اونچی جگہ کی طرف منہ کیے کھڑا تھا — ہم سینکڑوں میں تھے۔ اور اپنے مصرف سے نا آشنا۔ کہ تلقارمس نے کچھ لوگوں کے کان میں کچھ کانا پھوسی کی۔ وہ لوگ بھی آگے بڑھ کر تلقارمس کے ساتھ اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے — اور پھر ہمیں قبیلوں میں تقسیم کر کے اُن لوگوں کے حوالے کر دیا گیا — میں، اور وہ بھی مختلف قبیلوں کا حصّہ قرار دے دیئے گئے اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور پھر ایک دوسرے کے نام سے بھی نا آشنا ہو گئے۔

میں جس قبیلہ میں تھا۔ اس کا سردار "حبارا" تھا۔ بڑا ہی بھلا آدمی لیکن وقت پڑنے پر بڑا اجڑی، ظالم اور بڑبولا — وہ ہمیں ریوڑ کی طرح ہانک کر ایک طرف لیجانے لگا۔ تلقارمس تھوڑی دُور تک ہمارے ساتھ آیا اور پھر آہستہ سے میرے کان میں کہنے لگا —
"گھبرانا نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس سے پیشتر کہ میں اس کی طرف پلٹ کر دیکھتا وہ لپک کر دوسرے ریوڑ کی طرف بڑھ رہا تھا — میں بے زبانی کی کیفیت میں دَم بخود سا ایک پل رُکا اور پھر بڑھ کر اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔

شام ہوتے — ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔ ہمارا سردار حبارا جو بھلا آدمی تھا۔ تھک چکا تھا اور اُس کا لنگوٹ پسینے سے شرابور تھا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ہمارے قبیلے کی عورتوں نے لکڑیاں اکٹھی کر کے الاؤ جلایا اور سمندر میں سے پکڑی ہوئی مچھلی گرم راکھ میں دبا دی — حبارا اپنی نیم وا آنکھوں سے جو نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں سارے عمل پر نظر رکھے ہوئے تھا — ایسا لگتا تھا، سب اُس کی دسترس میں ہے اور وہ انتہائی مطمئن ہے —

وادی کے چرند، پرند اور درند الاؤ کے شعلے دیکھ کر اُلٹے پاؤں اندھیرے

میں منہ چھپا کر بھاگ نکلے! ہمارے قبیلے کی عورتوں نے اپنا مختصر لباس اُتار کر ہمارے سردار
حبارآ کے گرد طواف کیا ان کے برہنہ جسم الاؤ کے شعلوں میں تپے ہوئے تانبے کی طرح چمکتے
تھے وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہُوا صرف اس کے پسینے سے شرابور لنگوٹ کا سیال پتھر پر
سے بہتا ہُوا زمین میں جذب ہو گیا۔

پھر عجب تماشہ ہُوا ـــ جب ہم سب اپنے اپنے حصّے کی مچھلی لیکر کھانے لگے
تو معلوم ہُوا کہ ہم سب کا ایک ایک بازو غائب ہے ـــ اور ہمارا سردار حبارآ را جو بھلا آدمی تھا
ـــ اُس کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی ـــ وہ کبھی اپنے ایک ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی دوسرے
کندھے کو، جس پر سے بازو ندارد تھا ـــ

اچانک مجھے تلقارمس کی بات یاد آئی کہ میں نے ایک ہاتھ سب کے قریب
رینگتے ہوئے دیکھا۔ جس کا بازو بہت لمبا تھا اور جو خود آگے سے کسی بچھڑے کی تھوتھنی . . . . . .

تلقارمس کا ہاتھ سب کے کام آ رہا تھا۔ یعنی ایک ہاتھ اپنا اور دوسرا اُس کا۔
سب نے پیٹ بھر کھایا اور اپنے سردار حبارآ کا (جو کہ بھلا آدمی تھا) ـــ شکریہ ادا کیا اور سو گئے۔
خواب میں وہ تمام برہنہ عورتیں جن کے جسم الاؤ کے شعلوں میں تپے ہوئے تانبے کی طرح چمکتے
تھے ـــ ہم بستری کے لئے ہمارے ساتھ آ کر لیٹ گئیں۔

رات مزے سے کٹ گئی ـــ

صُبح ہمیں، ہمارے سردار حبارآ نے بیدار کیا جو بھلا آدمی تھا ـــ اُس نے
ہمیں بتایا کہ پہاڑ کے دامن میں دُور، دُور تک جو زمین پھیلی ہے وہ قبیلہ کی ہے اور وہ قبیلہ کا
سردار ہے ـــ پھر اُس نے حکم دیا کہ ہمیں اپنے اپنے کام پر لگ جانا چاہیے ـــ کمہار برتن بنائے
گا ـــ معمار مکان بنائے گا ـــ سُنار گہنے بنائے گا، لوہار اوزار بنائے گا، چمار جوتے اور کسان
کھیتی کرے گا ترکھان مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بنائے گا ـــ بنیا کھانے پینے کا
سامان رکھے گا جسے ہم اپنی محنت کے بدلے لے سکیں گے، پروہت پیدائش اور موت کے
وقت رسوم ادا کرے گا ـــ اور ہم سب اُس کے حکم کے پابند رہیں گے کہ وہ ہمارا سردار ہے
اور بھلا آدمی ہے ـــ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی سوچتا، سمجھتا اور سوال کرتا۔ کہ تلقارمس

نے کہیں سے وارد ہوکر اپنے ایک لمبے اور ایک چھوٹے بازوؤں کے آگے لٹکتے ہوئے ہاتھوں سے تالی بجائی ــــ اور سب نے خوش ہوکر ہاتھ اُٹھا دیئے

مَیں نے آگے بڑھ کر پوچھا ــــ "اور میرے ذمّہ کیا کام ہے سردار ؟"

سردار نے پلٹ کر تلقارمَس کی طرف دیکھا جو اپنا لمبا ہاتھ اپنے جسم کے گرد لپیٹ رہا تھا۔ تلقارمَس نے ایک بار مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں ہمارے سردار حبارا کے چہرے پر گاڑ دیں۔

سردار نے ہکلا کر پُوچھا ــــ "یہ کون ہے ؟"

"محُرر ــــ" تلقارمَس نے جواب دیا۔ "یہ تیرے قبیلے کا، تیرا، تیرے کارناموں اور تیرے وقت کا حساب رکھے گا۔ تاکہ آنے والی نسلوں کو تیرے بارے میں سب معلوم ہوسکے۔"

"لیکن یہ میرا چہرہ آنے والی نسلوں کو کیوں کر دکھائے گا۔؟" سردار نے پھر پوچھا۔

تب قریب کھڑا پروہت مسکرایا اور اُس نے آہستہ سے کہا ــــ "ہمارا سردار حبارا بہت بھلا آدمی ہے ــــ ہم اس کی مورتی بنائیں گے بالکل ایسی جیسا کہ یہ ہے۔ اور اسے بڑ کے پیڑ کے نیچے رکھ دیں گے ــــ کیوں کہ یہ ہمارا اگن دَیو ہے ــــ اس کی پوجا ہوگی۔

تلقارمَس، اپنا بازو اپنے جسم کے گرد لپیٹ چکا تھا۔ اس نے پروہت کا کندھا تھپتھپایا۔ زور سے ہنسا اور چلا گیا ــــ

سارا کاروبار ٹھیک ٹھاک چلنے لگا اور ہم نے اپنے سردار حبارا کی ایک مورتی بنا کر بڑ کے پیڑ کے نیچے لگا دی اور سِندور سے اُسے پوت دیا اور پوترندی کا جَل لا کر اُس پر چھینٹے مارے اور پوجا کے پھُول اُس کے قدموں میں رکھ دیئے ــــ پروہت نے سب کو آشیرواد دیا۔ ہمارا سردار حبارا یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔

(اور مَیں نے لکھا کہ کھیتوں سے فصل کاٹ لی گئی ہے۔ برتنوں میں کھانا بنتا ہے اور ہماری عورتوں کے جسموں کا تانبا بہت چمک اٹھا ہے اور یہ سب حبارا کا ہے۔ کہ وہ ہمارا سردار ہے۔ اور بھلا آدمی ہے ــــ پروہت نے سب سے اُس کی مورتی کی پوجا کروا دی ہے۔ چرند، پرند اور دَرند ہماری جلائی ہوئی آگ سے مانوس ہو چکے ہیں اور وہ جنگل کے

اندھیرے سے نکل کر ہمارے گرد منڈلانے لگے ہیں ۔)

ایک دن ہمارا سردار جبارا، پروہت کے ساتھ میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا "کیا لکھتے رہتے ہو۔؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے ——"

مَیں اپنی جگہ سے تعظیماً کھڑا ہُوا —— اور آہستہ سے بولا —"یہ سب آنے والی نسلوں کے لئے ہے سردار۔ تم کیا کروگے جان کر۔؟"

تب دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں —— اور پھر دونوں نے نظریں جُھکا دیں اور پروہت بولا "اِس کا فیصلہ تو پنچایت کرے گی" اور دونوں چلے گئے۔

پنچایت میں سردار، پروہت، بنیا اور کسان چار پنچ تھے اور پانچواں پنچ سردار کی وہ مورتی تھی جو برگد کے پیڑ کے نیچے رکھی تھی ۔ اور جس کی پوجا ہمارا دھرم تھا ——

میرا جُرم طے کیا جانا تھا اور پھر اُس کی سزا تجویز کرنا تھا —— مَیں پنچایت کی اس تشکیل سے مطمئن نہ تھا۔ کہ چاروں پنچ ایک دوسرے کے ساتھ مفاد کے دھاگے سے بندھے تھے ۔ اُس رات پرندے ایک پل بھی نہ سوئے درندے اپنی کھوہ سے نہ نکلے اور چرندوں نے گندے تالاب سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا اِس کے باوجود سب زندہ تھے، میرے سمیت ۔ مَیں کچھ ایسا فکرمند نہ تھا۔ مگر آئندہ نسلوں کے لئے . . . . !!!

اِس دُوران میں ایک اور واقعہ ہوگیا جس کی وجہ سے پنچایت مقرّرہ دن اکٹھا نہ ہو سکی ۔ ہُوا یوں کہ کمہار سے کچھ مٹّی کے برتن اور چھوٹے، موٹے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں خریدنے کے سلسلے میں پروہت کا لین دین کے معاملہ میں تنازعہ ہوگیا۔ پروہت، پروہت ہونے کے ناطے وہ دام نہ دینا چاہتا تھا۔ جو کمہار عام لوگوں سے لیتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ پیدائش اور موت کے وقت جو خدمت وہ سرانجام دیتا ہے —— دوسرے لوگ تو وہ سب نہیں کرتے ۔ لہٰذا اُسے رعایت ہونی چاہیئے —— کمہار کا کہنا تھا کہ پیدائش اور موت کے وقت پروہت جو خدمات انجام دیتا ہے۔ اُس کے بدلے وہ اپنی دَکھشنا وصول کر لیتا ہے پھر اُس کی محنت وہ کم داموں میں کیوں لینا چاہتا ہے۔؟

دونوں کے دلائل کافی معقول تھا۔ لہٰذا وہاں فیصلہ نہ ہو سکا اور یہ معاملہ بھی پنچایت پر چھوڑ دیا گیا جس دن اس مقدمہ کو طے کرنے کے لیے پنچایت اکٹھا ہوئی۔ اُس دن میرے والا معاملہ معمولی نوعیت کا سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ـــــ

پنچایت کے دو اور پنچ ـــ یعنی بنیا اور کسان بھی اس معاملہ میں کافی شش و پنج میں پڑے کہ اگر فیصلہ پروہت کے حق میں ہو جاتا ہے۔ تو اُس کو ایک دائمی حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ کسی سے بھی رعایتی داموں پر اپنی ضروریات کی اشیا خرید سکے۔ اور وہ دونوں بھی اس لپیٹ میں آجائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے آپ کو اس مقدمہ کے سلسلے میں پنچایت سے الگ کر لیا ـــ اب فیصلہ کرنے والے صرف دو لوگ بچے۔ ہمارا سردار حبارا، جو بہت بھلا آدمی تھا اور اس کی مورتی جس کی ہم پوجا کرتے تھے اور جسے کمہار نے ہی بڑے پیار سے بنایا تھا ـــ مگر مورتی خاموش تھی ـــ بول نہیں سکتی تھی ـــ پروہت چوں کہ مقدمہ میں فریق اول تھا۔ لہٰذا انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ دخل نہ دے۔ اب فیصلہ صرف سردار کے ہاتھ میں تھا۔ مگر ہمارا سردار حبارا چوں کہ بھلا آدمی تھا ـــ وہ مورتی کی رائے جانے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور مورتی جب تک بولے نہیں۔ رائے کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟

سب دم بخود تھے کہ اب کیا کریں؟ کئی ہونٹ یکدم حرکت میں آئے، ساری فضا میں چھپانے کی آواز گونجی۔ کئی گردنیں حرکت میں آئیں، کئی ہاتھ ٹھوڑیوں تک آکر ٹک گئے اور کئی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور پھر سکڑ گئیں ـــ کوئی کسی نتیجے پر نہ پہنچا ـــ اور پنچایت کا اجلاس کسی دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا ـــ سارے قدم مٹی بھری پگڈنڈیوں پر چلتے ہوتے اپنے اپنے ٹھکانے تک پہنچ گئے ـــ آگ جلی اور روٹیاں سینکی جانے لگیں ـــ اور پھر اندھیرے میں جھوٹے برتن چھوڑ کر مرد اور عورتیں کونوں کھدروں میں دبک گئے اور عورتوں نے مردوں سے اُس دن کی کاروائی کا خلاصہ مانگا ـــ اور مردوں نے وہ خلاصہ انہیں کہہ سنایا ـــ عورتیں بھی تذبذب میں پڑ گئیں اور تذبذب کی اس حالت میں اُن کے جسموں کی گرہیں اندھے ہاتھوں نے کھول ڈالیں ـــ

وہ اپنے لمبے بازُو کو، چھوٹے بازُو والے ہاتھ سے مالش کر رہا تھا — سورج نے آسمان پر ایک ہی قدم رکھا تھا اور سارے میں دھند لکا سا پھیلا ہُوا تھا۔ کہرہ پہاڑی کے دامن میں مچلتا ہُوا چل رہا تھا — درخت اور پودے اُس کہرے میں اپنا سبز رنگ ڈبوکر نچوڑ رہے تھے — اور پھر اُس کے کھِل اُٹھنے کے انتظار میں دھیرے، دھیرے پھنک رہے تھے — وہ ایک چٹان پر بیٹھا تھا اور اپنے لمبے بازُو کو، چھوٹے بازُو والے ہاتھ سے مالش کر رہا تھا — اُس نے اپنے کپڑے بالکل اُتار رکھے تھے اور پاؤں نیچے بہتی ہوئی ندی میں لٹکا رکھے تھے — مَیں ٹہلتا ہوا وہاں جا نکلا —

"نہانے کی تیاری ہو رہی ہے —؟" مَیں نے پوچھا۔

"اوہ، تم — دیکھو میں ننگا ہوں — تم دُور رہو — جسم کی کوئی بات نہیں لیکن میں نہیں چاہتا میرا یہ ہاتھ کوئی دیکھ لے —" تلقارمس نے قدرے درشتی سے جواب دیا۔

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے — سب کے انگ ایک جتنے لمبے، موٹے یا چھوٹے تو نہیں ہوتے — پھر بھی ..."

اِس سے پہلے کہ مَیں اپنا جملہ پورا کرتا۔ اُس نے ندی میں چھلانگ لگا دی — اور اپنا لمبا بازُو پانی میں چھُپا لیا —

اُس کا بدن کندن کی طرح دمکتا تھا۔ صاف، شفاف خوبصورت جسم — لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ وہ ندی میں جہاں کھڑا تھا اُس کے اِردگِرد کا سارا پانی جو تھوڑی دیر پہلے کنچن کی طرح صاف تھا۔ گدلا ہونے لگا — اُس کے جسم سے نہ جانے کیا چیز نکل کر پانی میں گھُل رہی تھی کہ پانی کا رنگ بدلتا جا رہا تھا — اور پھر دھیرے، دھیرے گدلے سے کیچڑ جیسا ہو گیا — وہ اپنے چھوٹے بازُو والے ہاتھ سے سارے جسم کو مَل، مَل کر دھو رہا تھا۔

مَیں چٹان کے قریب کھڑا یہ سب دیکھتا رہا اور مبہوت سا ہو رہا تھا۔ کہ آبادی کی طرف سے چند شبیہیں ندی کی طرف آتی دِکھائی دیں — اچانک میری اور تلقارمس

کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ اُس نے بھی اُن شبیہوں کو دیکھ لیا تھا شاید کہ مجھے چٹان کے پیچھے ہو جانے کا اشارہ کیا ___ مَیں نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی ___

اور پھر منظر صاف ہو گیا شبیہیں، انسانی صورتوں میں بدل گئیں ___ وہ تھے ہمارا سردار حبا آرا، پروہت اور دھوبی ___ دھوبی نے اپنے ہاتھوں میں اُجلے وَستر اٹھا رکھے تھے ___ پروہت نے پوجا کی تھالی اور سردار نے حلوہ اور مانڈہ ___ جیسے ہی وہ قریب آئے، تلقارمَس دھیرے، دھیرے ندی سے باہر نکلنے لگا۔ ننگا، برہنہ، عُریاں ___ مَیں اُلجھن میں پڑ گیا۔ کہ یہ پردہ محض مجھ سے تھا ___ اور دیکھ بھی رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کے سہارے پانی میں سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہے۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم کو روشن کر رہی ہیں اور اُس کے جسم میں سے سنہری روشنی پھوٹ رہی ہے ___ جب وہ پورے کا پورا باہر نکل آیا تو وہ تینوں اُس کے سامنے سَر جھکا کر کھڑے ہو گئے ___ وہ مسکرایا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑایا ___ گویا کسی کو آشیرواد دے رہا ہو ___ پھر پروہت نے سردار کو کچھ اشارہ کیا ___ اور سردار ہاتھ میں پکڑا ہُوا حلوہ مانڈہ دھوبی کو تھمانے کے لئے اس کی طرف بڑھا ___ دھوبی نے اُجلے وَستر ایک ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے ہاتھ میں حلوہ مانڈہ پکڑ لیا ___ تلقارمَس جیسے چونک اُٹھا۔ لیکن تیزی سے اُس نے اپنے چہرے کی مچھلیوں پر قابو پا لیا اور اس کی مخصوص فرشتوں جیسی مُسکراہٹ دوبارہ اُس کے چہرے پر قابض ہو گئی۔

ہمارے سردار حبا آرا نے ___ جو بہت نیک آدمی تھا ___ آگے بڑھ کر اپنے انگوچھے سے تلقارمَس کا بدن پونچھنا شروع کیا ___ بدن یعنی کہ بدن کا ہر انگ، حتّٰی کہ اُس کا لمبا بازو بھی ___ اور جب بازو پونچھ دیا گیا تو تینوں نے مِل کر اُسے اُس کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔ پھر اُسے اُجلے وَستر پہنا دیئے گئے۔ پروہت نے آگے بڑھ کر اُس کے ماتھے پر سندور کا تلک لگایا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر آرتی اُتاری ___ تب وہ سب ایک چٹان پر بیٹھ گئے ___ ندی کا پانی خاموشی سے بہتا رہا اور تلقارمَس کے جسم سے اُترا ہُوا کیچڑ پانی کے ساتھ بہہ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تلقارمس سے اُنہوں نے اپنے قبیلے کا حال بیان کیا — پنچایت کے سامنے جو مسائل تھے وہ کہہ سُنائے — تلقارمس آہستہ سے اُٹھا اور اُن کے گرد چکر لگاتا ہُوا ٹہلنے لگا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہو۔ پھر رُکا اور آہستہ سے چلتا ہُوا اپنی پہلے والی جگہ پر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا۔

"سردار حبارا۔ تیرے قبیلے کے لوگ کیا کہتے ہیں — ؟ اس معاملے میں اُنکا ردِّ عمل کیا ہے ؟"

"وہ کیا بولیں گے — وہ تو چُپ ہیں۔" سردار حبارا نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"تم بہت بھولے ہو۔ جو چُپ ہوتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جس سے کچھ کہنے کے لئے نہیں کہا جاتا — اُسی کے اندر لاوا اُبل رہا ہوتا ہے۔ تم کل پھر پنچایت بلاؤ — اور اپنی مورتی کی بجائے اُن سے رائے مانگو —"

مَیں نے دیکھا۔ پروہت اور سردار حبارا پہلے بھونچکے سے رہ گئے پھر گہری سوچ میں ڈُوب گئے۔ اچانک اُن کی نظر دھوبی پر پڑی — وہ اُن کی باتیں سُن کر کافی بے چین دکھائی دیتا تھا۔

سب اُٹھے — اور وہ تینوں تلقارمس کو وہیں چھوڑ کر گاؤں کی طرف بڑھنے لگے — جب وہ چلے گئے تو تلقارمس میرے قریب آیا اور بولا۔

"کل یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ تمہیں کیا لکھنا ہے۔" اور پھر ایکا ایکی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ مَیں نے سمجھا شاید وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اُس کے قہقہے کی آواز سے ندی کے بہاؤ میں بہتی ہوئی ایک مچھلی اپنا سر پانی سے نکال کر اُس کی طرف دیکھنے لگی — اور پھر مسکرا کر پانی میں ڈُوب گئی۔

مَیں نے پوچھا — "تلقارمس — مَیں کہاں سے آیا تھا ؟ — اور مَیں یہاں کیوں ہوں ؟ اور میرے دو ساتھی تھے — جن کے نام مَیں بھول چکا ہوں — وہ کہاں ہیں — ؟"

تلقارمس نے بغور میرے چہرے پر دیکھا — اور فکرمند سا ہو گیا اور پھر آہستہ

سے بولا۔

"تو کیوں نہیں اپنے ماضی کو بھول جاتا ــــ اور اپنے پچھلے ساتھیوں کو ــــ یاد رکھ یہ بات تم سے خون کے آنسو رلوائے گی اور تو بڑے عذاب جھیلے گا ــــ اچھا ہے تو اپنی جڑیں ماضی کی زمین میں سے اکھاڑ لے اور انہیں حال کی دھوپ میں سوکھنے کے لئے پھیلا دے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے وہ چلتا ہوا ندی پار کر گیا ــــ

اگلے روز پنچایت میں بڑا واویلا ہوا۔ سب بولنے لگے ــــ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بس اتنا پتہ چلا کہ کمہار سے کم داموں برتن ہتھیانے کے سب خلاف ہیں۔ میں کون ہوں کیا کرتا ہوں اور کیا لکھتا ہوں اور کیا لکھنا چاہیے ــــ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔

پروہت اور ہمارا سردار حبارا اور بنیا تینوں کافی فکر مند ہو اٹھے ــــ تب پنچایت کسی قسم کا فیصلہ کیے بنا ہی برخواست کر دی گئی ــــ

رات تلقارس اندھیرے میں سے ابھرا اور ہمارے سردار حبارا کے پاس جا کر بولا۔

"کیوں دیکھ لیا ــــ ؟ یہ سب کھلے میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ان سب کا مفاد سانجھا ہے۔ اگر سردار رہنا چاہتے ہو تو انہیں گھروں میں تقسیم کر دو ــــ ان کے گرد دیواریں کھڑی کر دو ــــ اور حفاظت کے نام پر ان کے سروں پر چھت مہیا کر دو ــــ انہیں اپنی عورتوں کے ساتھ تنہائی میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر مباشرت کرنے پر اکساؤ ــــ"

ہمارا سردار حبارا یہ سب سنتا رہا ــــ اور سوچتا رہا ــــ میں نے سوچا۔ مجھے یہ سب لکھ دینا چاہیے ــــ آنے والی نسلوں کے لئے کہ کیسے ہم پیشوں میں اور پھر گھروں میں بٹ گئے تھے۔

آدھی رات کو چاند نکلا تھا ــــ پھر آسمان پر ٹہلتا ہوا پھیکا پڑ گیا کہ سورج نے ساری سیاہی پی لی اور اُس کے سنہرے ترکش سے نکلے ہوئے تیر ساری کائنات کے سینے میں پیوست ہو گئے۔

جگہ، جگہ مٹّی کھُدنے لگی اور گارا بننے لگا۔ پتھر ٹوٹنے لگے اور ان کو چوکور بنایا جانے لگا ــــ اور تعمیر شروع ہو گئی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے، چھوٹے گھر بننے لگے۔
"کرُسی پر بیٹھی لاش نے کہا ــــ" میرا ایک ٹکڑا اُکتیا کی طرف پھینک دُو ــــ وہ شانت ہو جائے گی۔
ڈرو نہیں، جو بھی یہاں آیا اُس نے ایسا ہی کیا۔"
تب سب خوش تھے اور جب وہ گھر بنا چکے تو پھر سب نے مِل کر بڑے چاؤ سے اپنے سردار جبارؔ کا محل بنایا کہ جو بڑا بھلا آدمی تھا۔ گو کہ میرے لکھے اور نہ لکھے سے اُن کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پھر بھی عادت سے مجبور تھا اور میں نے اپنی پوتھی میں لکھا ــــ"
کہ راوی سب طرف چین ہی چین بیان کرتا ہے۔"

جنگل میں سے دھُول اُڑتی دِکھائی دی اور پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ــــ اور عجیب و غریب نعرے ــــ ہزاروں آوازیں مل کر کچھ کہہ رہی تھیں ــــ اور ہمارے شہر میں ہر گھر مال و متاع سے بھرا ہُوا تھا۔ بازار اور ہاٹ مال و اسباب سے اَٹے ہوئے تھے۔

مَیں نے پہاڑ پر چڑھ کر دیکھا ــــ وہ سب ہتھیار بند تھے۔ اور اُن کے ہاتھوں میں پکڑے ہتھیاروں کی چمک سے جنگل کے چرند پرند اور درندوں کی آنکھیں خیرہ ہو اُٹھی تھیں۔ وہ غیر اِرادی طور پر چھپانے، گنگنے اور غرانے لگے تھے ــــ ہتھیار بند سپاہ کے آگے ہراول دستہ کو جو شخص راستہ دکھا رہا تھا ــــ وہ جانا پہچانا سا لگا ــــ مَیں نے غور کرنے پر دیکھا تو پھر اُسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ وہ پرَبل کمار تھا۔ لیکن اُسکی سج دھج

ہی نرالی تھی۔ باقی تو سب سیجھے ــــ خاص چیز تھی اُس کی کمر سے لٹکتا ہُوا خالی نیام اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ننگی تلوار۔

مَیں بھی کتنا کوتاہ بین ہوں۔ کہ نہیں جانتا کہ اپنے شہر سے آگے اور بھی شہر ہیں۔ اور اُن شہروں میں دوسرے قبیلے بستے ہیں۔ اور اُن قبیلوں کا بھی کوئی سردار ہے۔ جو ہمارے سردار حبارآ کی طرح بڑا بھلا آدمی ہے ــــ اور ہمارے سردار اور اُس سردار کے مفادات آپس میں ٹکرا بھی سکتے ہیں۔ اور میرا پکا دوست پربل کمار ــــ اُس قبیلے کے سردار کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ اور مجھے پہچاننے سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

اِن سب باتوں کے نتیجے کے طور پر ہمارے قبیلے میں اور پربل کمار کے قبیلے میں گھمسان کا رَن پڑا ــــ ہمارے قبیلے کے لوگ اپنے، اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے ــــ اور حتیٰ المقدور حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ــــ اِس سارے عمل میں ہمارے سردار حبارآ کی سپاہ تعداد میں ذرا کم پڑ گئی وہ جنگ ہار گیا۔ ہم سب بندی بنا لئے گئے ــــ اور فاتح قبیلہ کے سردار کے سامنے مشکیں باندھ کر پیش ہوئے ــــ وہاں مَیں نے دیکھا ــــ فاتح قبیلے کے سردار کے ساتھ کھڑا تلقارمَس بڑے انداز سے بات چیت میں مشغول تھا۔ بات چیت کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہُوا ــــ ہمارے سردار حبارآ (جو بڑا بھلا آدمی تھا) ــــ کا سر قلم کر دینے کا حکم ہُوا ــــ اور ہم سب فاتحین کے غلام بنا کر چھوڑ دیئے گئے۔ مگر چھوڑے جانے سے پہلے ہم سب کے چوتڑ داغ دیئے گئے۔ تاکہ پہچانے جا سکیں۔ اور فاتح قبیلے کے لوگ ہمارے گھروں کے اندر گھُس گھُس کر ہمارے دیوی، دیوتاؤں کی مورتیوں کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

یہ ساری داستان مَیں نے حامد مرزا کو سُنائی۔

اُب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچھڑا ہوا حامد مرزا مجھے کہاں ملا ــــ؟ پربل کمار پر کیا گذری؟ اور ہم تینوں دوستوں کا وِصال کیوں کر ممکن ہُوا ــــ؟

فاتح قبیلے کے سردار نے وہ رات جشن منانے کا حکم دیا۔ ہمارے

گھر اور ہمارا رہن سہن اُن کے لیے بڑی ترقی یافتہ چیز تھی ــــ سردار کبھی اپنے پچھڑے پن کی وجہ سے آہِ سرد بھرتا اور کبھی سب تاراج کر دینے کی خوشی میں قہقہہ لگاتا ــــ تلقارمَس بڑے غور سے ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ مگر کچھ بول نہیں رہا تھا۔ خاموشی کتنی خطرناک چیز ہے اِس کا اظہار وہ خود ہی کر چکا تھا۔ اُس کی فکر مندی کی وجہ سے اُس کا بچھڑے کی تھوتھنی سا ہاتھ بُری طرح تڑپ رہا تھا ــــ پَربل کمار پھر دکھائی نہ دیا۔ معلوم ہُوا کہ وہ زخمی ہے اور گھنے جنگل میں کسی جڑی بوٹی کا لیپ کر کے دھوپ میں لٹا دیا گیا ہے ــــ رات ہونے اور جشن کی شروعات میں ابھی دیر تھی۔ مَیں خراماں، خراماں گھنے جنگل کی طرف بڑھا ــــ چلتا گیا، چلتا گیا حتےٰ کہ اُس جگہ پہنچ گیا جہاں زخمی لیپ کر کے دھوپ میں لٹائے ہوئے تھے ــــ وہاں وہ بہت سے تھے۔ سب ایک خاص قسم کے لیپ سے لتھڑے ہوئے تھے ــــ کسی کا بھی چہرہ پہچانا نہ جا سکتا تھا ــــ مَیں اُسے تلاش کرتے، کرتے تھک گیا آخر ایک شخص کے پاس بیٹھ کر مَیں نے اپنا حال کہہ سُنایا یہ سمجھ کر کہ وہی شاید پَربل کمار ہو ــــ لیکن افسوس وہ شاید وہ نہیں تھا۔ کہ اُس نے کوئی ہنکارہ نہ بھرا مَیں چُپ چاپ وہاں سے اُٹھا اور بستی کی طرف بڑھا۔ بھاری دِل سے کہ مجھے غم تھا۔ اپنے بچھڑے ہوئے دوست کے دکھائی دے کر پھر بچھڑ جانے کا ــــ

بستی کے عین وسط میں بڑا سا الاؤ جل رہا تھا۔ اُلاؤ میں کچھ جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں تھیں اور کچھ ہمارے گھروں کا ایندھن تھا ــــ جو برسات کے موسم کے لیے جمع کر کے رکھا تھا۔ کہ جب سب طرف جل تھل ہو جائے گا تو گھروں میں روٹیاں سینکنے کے کام آئے گا ــــ سب جلایا جا رہا تھا۔ ہمارے موسم برسات کے لیے بچائے ہوئے ایندھن کا لحاظ کیے بغیر ــــ

مَیں الاؤ کے گرد بیٹھے لوگوں میں جا بیٹھا۔ فاتح اور مفتوح ساتھ، ساتھ بیٹھے تھے۔ سردار اور تلقارمَس ایک چبوترے پر تھے ــــ اِردگرد مشعلیں جل رہی تھیں۔ بہت سے ساز جن پر جانوروں کی کھالیں منڈھی ہوئی تھیں ــــ دھم دھم دھما دھم بجائے

جا رہے تھے۔ لوگ خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ بھُنا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ مٹّی کے کٹوروں میں عرق پی رہے تھے۔ اَچانک تلقارمَس اور سردار میں کچھ کانا پھوسی ہوئی ــــ اور پھر سردار کا چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا ــــ اُس نے دایاں ہاتھ اُٹھا کر ایک طرف اِشارہ کیا ــــ اُس طرف کھڑے آدمی نے سر جھکا کر حکم بجا لانے کا جوابی اِشارہ کیا اور پھر اندھیرے میں گم ہو گیا ــــ دھما دھم کی آواز مزید بلند ہوئی ــــ بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو مزید پھیلی ــــ اور شور کچھ سوا ہو گیا ــــ کہ اچانک عورتوں کی چیخ و پکار سُنائی دی ــــ اُسی طرف سے جس طرف وہ حکم کا بندہ اندھیرے میں گم ہُوا تھا۔ پھر دیکھا کہ اندھیرے میں سے کچھ جسم نمودار ہوئے جن پر الاؤ کے شعلے ناچ رہے تھے ــــ وہ جسم ہمارے قبیلے کی عورتوں کے تھے جن کو بالکل برہنہ کر دیا گیا تھا۔ اور وہ اپنی بے پردگی اور بے بسی کے احساس سے آہ و بکا کر رہی تھیں اُن کی آنکھوں کے آنسو اُن کے پستانوں پر گرتے اور پھر پیٹ پر سے بہتے ہوتے زیرِ ناف بالوں میں گم ہو جاتے۔ اُن کے بال کھُلے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے لمبے اور گھنے بالوں سے اپنے برہنہ جسموں کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ــــ اُن سب کی گردنوں میں رسّیاں بندھی تھیں اور وہ گھسیٹ کر الاؤ کے پاس لائی جا رہی تھیں۔ اُس جگہ جہاں چبوترے پر فاتح قبیلے کا سردار بیٹھا تھا۔ اور تلقارمَس، پروہت کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا ــــ فاتح قبیلے کے لوگ خوشی سے اُچھل رہے تھے اور ہم سب کے سَر شرم، شرمندگی اور نامردی کے احساس سے جُھک گئے تھے۔ ہمارے پروہت نے سر اُٹھایا اور ہجوم کی طرف دیکھا۔ شور ذرا کم ہُوا پھر اُس نے اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھایا ــــ اور فضا میں عورتوں کی ہچکیوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی ــــ پروہت نے اعلان کرنا شروع کیا۔

"ــــ حبارا قبیلے کے لوگو اور پشارا قبیلے کے لوگو ــــ!

ہمارا نیا سردار پشارا بڑا مہربان ہے ــــ اُس نے ہم پر حکومت کرنا قبول کر کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔۔ وہ ہم سے پکّا رشتہ قایم کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ ہماری عورتوں کے بطن سے

اُس کے قبیلے پشارا کے بچے پیدا ہوں۔ تاکہ ہمارا اور اُن کا خون ایک ہو جائے۔ ہمارا نیا سردار پشارا ابھی ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی کرے گا — اور وہ بیاہ پڑھانے کا فرض اُس نے مجھ پر عاید کیا ہے — مَیں اُس کا شکر گذار ہوں — اور آپ سب کو بھی شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اُس کی طرف سے اَب ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی — ہم پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اور اُس نے یہ بھی وعدہ کیا ہے — کہ ہمارے داغے ہوئے چوتڑوں پر جڑی بوٹیوں کا لیپ لگایا جائے گا تاکہ زخم بھر جائے — اُس نے کہا ہے کہ اُسے زخم سے کوئی سروکار نہیں — بس وہ چاہتا ہے کہ داغ قایم رہے۔ اَب حبارا قبیلے کے لوگ اور پشارا قبیلے کے لوگ مِل کر ناچیں گے اور پھر ہماری عورتیں اپنے آپ کو پشارا قبیلے پر نچھاور کر دیں گی — اور پھر ہمارا خون اور اُن کا خون ......"

اِس سے پیشتر کہ وہ اپنا جُملہ پورا کرے۔ دھم دھما دھم کی آوازیں بلند ہوئیں اور پشارا قبیلے کے لوگ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے — چیختے اور چلّاتے ہوئے اپنے حلق اور حلقوم کا پورا استعمال کرتے ہوئے ناچنے لگے۔ ہمارے قبیلے کے لوگ اور عورتیں اُس بھیڑ کا حصّہ بن گئیں اور پھر اتنی دُھول اُڑی کہ آنکھ پڑی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔

ناچ رنگ اور شراب رات بھر چلتا رہا — صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے سردار پشارا نے ہمارے قبیلے کی سب سے زیادہ حسین اور کم سِن عورت جَنتّاں سے بیاہ رچایا — بیاہ سے پہلے ایک بوڑھی عورت نے جنتّاں کی اندام نہانی میں انگلیاں ڈال کر اُس کا اچھّی طرح سے معاینہ کیا اور پھر سردار پشارا کی طرف دیکھ کر مُسکرائی — سردار پشارا نے اپنے ماتھے کا پسینہ اپنی انگلی پر لے کر اُس بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر مَل دیا۔ عورت خوش ہوئی — اُس نے سَر جُھکایا اور واپس چلی گئی —

اُس سارے ہنگامے میں تلقارمَس کہاں غائب ہوگیا کچھ پتہ نہیں لگا۔

وقت گذرتا گیا سب ٹھیک ٹھاک چلنے لگا — گھر کے آگے آنگن بنے اور چاردیواری

سی چن دی گئی ــــ ہمارے کھیتوں میں اور گھروں کے آنگنوں میں پیٹ پھولی عورتیں چہل قدمی کرتی دکھائی دیتیں۔ اُن کے پیٹ میں ہمارے نئے سردار پشارا کے قبیلے کی انتہائی قیمتی امانت محفوظ تھی۔

خبر آئی کہ ہمارے قبیلے کی حسین ترین اور کم سن عورت جنتاں نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اور ہمارے نئے سردار پشارا نے اعلان کیا ہے ــــ کہ جنتاں کے بطن سے پیدا ہُوا بچہ ہی اُس کے قبیلے کا وارث ہوگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ بات ہمارے قبیلے کیلئے قابلِ فخر ہے اور خوشی کا مقام ہے۔

"اب تو خوش ہو ــــ؟" ایک جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ تلقارمَس کھڑا مسکراتا ہُوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اوہ ــــ تم ــــ؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ــــ "کس بات پر خوش ہونا چاہیے ــــ؟"

"اب پشارا قبیلہ تمہارے حبارا قبیلے کا غلام ہوگیا ــــ"

"وہ کیسے ــــ؟"

"اوہو ــــ تم راج نیتی نہیں سمجھتے ــــ!"

"راج نیتی ــــ؟"

"ہاں۔ راج نیتی۔ اسے راج نیتی کہتے ہیں نوتیج ــــ پشارا قبیلے کے سردار نے حبارا قبیلے پر حملہ کیا۔ خون خرابہ کیا ــــ اور اس قبیلے کی ہر چیز پر قابض ہوگیا۔ یُں نے جنتاں کی شادی اُس سے کروادی جو اس قبیلے کی حسین ترین اور کم سن عورت تھی ــــ سردار پشارا کے نطفہ سے اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہُوا جو دونوں قبیلوں کا وارث ہوگا۔ یعنی کہ پشارا قبیلے کے لوگ حبارا قبیلہ کے بطن سے پیدا ہونے والے بچّہ کے غلام ہونگے بولو، فتح کس کی ہوئی ــــ؟"

مَیں حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ تلقارمَس ہنس رہا تھا۔ اُسکا بچھڑے کی تھوتھنی جیسا ہاتھ تڑپ رہا تھا۔

ہمارے قبیلے کے لوگ پشارا کی پہاڑی پر پہنچے تاکہ بچّے کو دیکھ سکیں میں بھی اُن سب کے ساتھ تھا۔ بچّہ دھوپ میں لیٹا ہُوا کلکاریاں مار رہا تھا ــــ ہم باری باری اُسے دیکھتے اور خوش ہوتے ہوئے جنتاں کے قریب جاتے تھے اور شکریہ ادا کرنے کے انداز میں سر جھکا دیتے تھے وہ مسکراتی تھی۔

جب میری باری آئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بچّہ بالکل حامد مرزا تھا۔ میں ہکّا بکّا سا ہو اُٹھا ــــ بچّہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور تیزی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا

میں اس وقت تک وہاں رہا جب تک کہ وہ بچّہ جوان نہ ہو گیا ــــ

اِس دوران ہم نے بڑے، بڑے مندر بناتے اور اُن میں اپنے من پسند دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں ستھاپت کیں ــــ ہماری عورتوں نے کئی بچّے جنے ــــ اور پھر ہماری زمین اُن بچوں میں تقسیم ہو گئی ــــ ہم سب غریب ہو گئے اور نئی زمین کی تلاش میں نکلنے کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ کہ حامد مرزا نے سردار پشارا کو موقعہ پا کر قتل کر دیا ــــ اور اپنی لہو میں لت پت تلوار اپنی ماں جنتاں کے قدموں میں رکھ کر کہا ــــ

میں نے تیری عصمت دری کا بدلا لے لیا۔ مجھے آشیرواد دے ــــ"

جنتاں نے آشیرواد دیا ــــ اور ہم سب بھی آشیرواد دینے کیلئے آگے بڑھے اور پروہت نے حامد مرزا کی پیشانی پر تلک لگا کر اُس کے گلے میں پھول مالا ڈالی ــــ تلقارمس نے پروہت کے کان میں کچھ کہا۔ جسے ہم نے بالکل نہ سُنا ــــ ہم نے تو سُنیں دھائیں، دھائیں کی وہ آوازیں۔ جو شاید دُور شہر میں گولی چلنے کی وجہ سے بلند ہوئی تھیں۔

میں آہستہ، آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا ــــ قدموں کی ایک آہٹ میرے آگے تھی اور ایک آہٹ میرے پیچھے ــ میں بہت تھک گیا تھا جیسے بڑی لمبی مسافت طے کی ہو ــــ مگر اتنا ہی تو تھا کہ کنویں میں اُترا تھا ــــ

"خیر اس بات کا تو پتہ چل گیا کہ کنواں دَل دَل سے اٹا ہُوا نہیں ہے"

آواز میرے پیچھے سے آئی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پربل کمار آہستہ آہستہ میرے پیچھے آرہا تھا۔
"میں تو پہلے ہی کہتا تھا پربل کمار کہ یہ تیری نظر کا دھوکا ہے ــــ" آواز میرے آگے سے آئی ــــ میں نے سر اٹھا کر دیکھا ــــ حامد مرزا کنویں کے اندر سے نکل کر مینڈھ تک پہنچ رہا تھا۔

ہم تینوں کنویں میں سے نکل کر اُس کے چبوترے پر سے کُودے اور گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اچانک گرجا گھر کا گھڑیال بجنے لگا۔ ہم تینوں نے اُس طرف دیکھا تو ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جس چبوترے پر کبھی عیسےٰ کا مجسّمہ تھا، وہاں اب تلقارس کا بڑا سا مجسمہ کھڑا تھا۔ جس کا لمبا بازُو آسمان کی طرف اُٹھا ہُوا تھا چبوترے کے نیچے سوکھی ہوئی گھاس کے انبار میں ایک بھیڑ مری پڑی تھی۔ اور مریم کی مورتی بدرنگ ہو چکی تھی اُس مورتی کے پستان اور اندامِ نہانی خون آلوُد تھی۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریسٹوراں تک پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ ٹھگنے قد کا فربہ آدمی جس کے چہرے پر بشاشت پھیلی رہتی تھی۔ کاونٹر پر، پی ہوئی چائے کے پیسے دے رہا تھا۔ نہ اُس نے ہماری طرف دیکھا نہ ہم نے اُس کی طرف دیکھا۔ ہم تو بس خوش تھے کہ ہمیں ہمارے بھولے ہوئے نام یاد آ گئے ہیں حامد مرزا، پربل کمار اور نوتیج۔

ہم تینوں نے اپنی، اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا اور گفتگو میں محو ہو گئے ــ ہم نے اپنے تمام مسائل پر بات چیت کر ڈالی ــ چائے آ گئی ــ چائے پی گئی ــ بڑا لطف آیا ــــ اچانک پھر ایک طرف سے دھائیں، دھائیں کی آواز آئی ــــ کچھ لوگوں نے اُس سمت دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی ــ سڑک پر سے ایک پُرانا کھڑکھڑاتا ہوا ٹرک گذر گیا جس کے ٹوٹے ہوئے حصّوں میں سے انسانی ٹانگیں لٹکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اور کچھ ــــ؟" ویٹر نے آکر آہستہ سے پوچھا۔ ہم تینوں چونکے ــــ "اب چلنا چاہیے" ہم تینوں نے ایک ساتھ سوچا ــ "نہیں کچھ نہیں" ہم تینوں نے ویٹر کو جواب دیا۔ اور اگلے دن ملنے کا وعدہ کر کے اپنی، اپنی جگہ سے اُٹھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے

بڑھائے۔

"یہ کیا ___؟ ہم میں فاصلہ اتنا کیوں کر ہو گیا ___؟" ہم تینوں نے ایک ساتھ سوچا۔ اور پھر ہمیں احساس ہُوا کہ ہم تینوں کا مصافحہ کے لئے بڑھا ہوا بازو بہت لمبا ہو گیا ہے۔

۔جمہورۂ الفریم اُداس اور ویران ہے۔ اُس کے فرش پر ایک لاش رکھی ہے۔ جس کا انگ، انگ . . . . . ۔

○

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء

چھوڑا ہُوا شہر

"گاڑی چھوٹنے میں ابھی کافی وقت ہے!" میں نے اپنا بڑا سا اٹیچی کیس فٹ پاتھ پر رکھتے ہوئے سوچا۔ سینما ہال کے باہر 'ہاؤس فل' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ پکچر بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ فرض کر لینے کے باوجود میں بکنگ کلرک کے پاس گیا۔ اُس کے پاس ایک ہی ٹکٹ تھا، وہ بھی چکنائی میں لتھڑا ہُوا، شاید کسی عطار کے لونڈے نے واپس کیا تھا۔

ٹکٹ میرے پاس تھا، مگر مسئلہ اٹیچی کیس رکھنے کا تھا کیوں کہ ضابطے کے مطابق سینما ہال میں اٹیچی کیس نہیں لیجایا جاسکتا۔ بکنگ کلرک کے پاس ایک آدمی کھڑا نوٹ اور ریزگاری گن رہا تھا۔ اس نے ابرو کا اشارہ کرکے مجھے کہا "اسے پچھلی طرف رکھ دو!"

"پچھلی طرف؟" میں پھُس پھُسایا اور پھر یک دَم خوف زدہ ہوگیا۔ دراصل اُس نے اُسی جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا جسے میں چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ مگر اب ٹکٹ بھی خریدا جا چکا تھا اور ٹکٹ بھی آخری اور چکنا تھا۔

پچھلی طرف ایک ریستوران تھا جس کے کاؤنٹر پر میری محبوبہ بیٹھی بل کاٹ رہی تھی۔ وہ مجھے کئی برسوں کے بعد دکھائی دی تھی۔ میں نے اُسے دائیں رخسار کے 'ٹیومر' کے داغ سے پہچانا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس نے اپنا کھلا ہُوا قلم کیش میمو بک پر رکھ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنا اٹیچی اس کی اونچی کرسی کے قریب رکھ دیا اور پوچھا "کب آئیں؟"

ریستوران بالکل ویران پڑا تھا۔ اور ریستوران کی ویرانی دھیرے دھیرے اسکی آنکھوں سے جھانکنے لگی (یہاں ایک بات واضح کردوں کہ اوپر جس عورت کا ذکر آیا ہے میں نے زندگی میں اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔)

"اُن کے قتل کے بعد نیروبی میں میرا رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر میں یہاں آگئی۔ یہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ تم بھی آج ملے ہو۔ میں اس ریستوران میں ملازم ہوں۔ کیا کرتی آخر....!"

اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

مَیں نے بڑھ کر اسے باہنوں میں بھر لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ شاید اسے زندگی میں پہلی بار سیکورٹی کا احساس ہُوا تھا۔ مَیں تو گویا شرم سے پانی پانی ہو گیا کیوں کہ میری باہنوں کے حلقے سے زیادہ ان سیکور INSECURE چیز اور کوئی اِس دُنیا میں نہیں ہے۔

(اب یہاں عجیب تماشہ ہُوا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ ہم سینما ہاؤس میں گھس گئے ہیں اور فلم دیکھ رہے ہیں یا باہر سڑک پر گھوم رہے ہیں۔)

اچھّی خاصی بربادی کا منظر تھا۔ سڑکوں پر چھوٹے بڑے پتھر، روڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے اور جا بجا گندگی اور کوڑا کرکٹ کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں فوجی سیاہ خود پہنے اپنے بھاری بھر کم بوٹوں سے سڑک پر تڑاخ تڑاخ کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ اس کا دایاں ہاتھ میرے بائیں کندھے پر تھا۔ مَیں نے دیکھا وہ قدرے سہمی ہوئی ہے۔ پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لاکر سرگوشی کی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ وہ تو ہے!" مَیں نے جواب دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان عمارتوں کی طرف دیکھنے لگا جو اب ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔

"بہت تباہی ہوئی ہے!" ہمارے پاس سے کوئی کہتا ہوا گزر گیا اور ہم دونوں نے دل ہی دل میں اس سے اتفاق کیا۔

یہاں پہنچ کر سڑک ختم ہو جاتی ہے۔ آگے دُور تک نشیب پھیلتا چلا گیا ہے اور اس سے آگے مٹّی کی جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے اور سامنے بھُورا اونچا پہاڑ دکھائی دے رہا ہے۔ ہماری دُنیا کی حد یہیں تک ہے۔

"یہاں یہ بھی مصیبت ہے کہ کبھی کبھی یہ پہاڑ جلنے لگتا ہے۔" وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔ اِس تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سامنے سے ایک حمال (مزدُور) سر پر ایک بڑا سا ٹوکرا اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ٹوکرے میں ایک فوجی افیسر زخمی حالت میں کراہ رہا تھا۔ اُس کی سفید وردی خون

سے لت پت تھی، چہرے پر انتہائی غصہ تھا اور بائیں ہاتھ میں تنا ہُوا ریوالور تھا۔

سارے ماحول پر ایک عجیب طرح کی بے چینی سی پھیل گئی۔ سب منہ اٹھائے ایک طرف دیکھنے لگے (مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ سب کون ؟ جب کہ پوری سڑک پر سوائے ہمارے اور کوئی نظر ہی نہیں آرہا۔ (اور پھر ہم بھی کیا۔ ؟ کہ بس محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ہیں اور بس، کوئی شے دکھائی تو دے ہی نہیں رہی ہے۔))۔

ایک پرانا شکستہ ٹرک کھڑکھڑاتا ہُوا ہمارے بائیں طرف سے دائیں طرف بڑھ گیا۔ ہم غور سے اِس ٹرک کو دیکھنے لگے۔ اِس میں کچھ شناسا چہرے دکھائی دئے۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ وہ میری بیوی اور بچّے تھے جو اپنے دیگر رشتے داروں کے ساتھ تھے۔ وہ سب جی بھر کر اداس تھے۔ عورتوں کے سروں پر میلے، بوسیدہ پھٹے پرانے دوپٹّے تھے اور مردوں کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔۔۔ میں ان سب کے بارے میں کچھ سوچنے لگا تھا کہ اچانک رُک گیا — جس زمین پر ہم چل رہے تھے وہ دھیرے دھیرے بیٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور ہم لڑکھڑا گئے۔

اس نے کہا: "دیکھ رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے ؟"

"کئی برسوں سے ایسا ہو رہا ہے!" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "اور اب تو ہم عادی ہوگئے ہیں۔" (کہنے کو میں یہ سب کہہ گیا اور پھر خود ہی حیران ہُوا کہ آخر کب سے ایسا ہو رہا ہے ؟ اس سے پہلے تو مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہُوا تھا۔)

"بڑی عجیب بات ہے!" اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہ ایک پرانے شکستہ ٹرک میں سوار ہو کر میرے پاس سے گزر گئے۔ انھوں نے مجھے کتنی حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اور میں۔۔۔ ؟ مجھے زمین نے پکڑ رکھا ہے، جو لمحہ لمحہ دھنستی جا رہی ہے ؟" میں نے گہرے رنج سے کہا۔

"یہ سچ ہے!" اُس نے بھی انتہائی رنجیدہ انداز میں کہا۔

میں نے محبت سے نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ ایکا ایکی مجھے احساس ہُوا کہ اردگرد سب بدلا جا رہا ہے۔ حتّٰی کہ اُس کا سراپا بھی بدل گیا ہے، میں سہم گیا — اور پھر

انتہائی خوف زدگی کے عالم میں پوچھا "کون ہو تم؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں۔ میرے پانچ خاوند تھے اور تم ان سب میں بڑے ہو!" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ اُس کا بنایا ہُوا یا بسایا ہُوا شہر ہے جس کی ہم سیر کر رہے ہیں!"

"مگر وہ ہے کہاں؟" مَیں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ خود چلا جاتا ہے۔ مجھے اُس نے کہا تھا کہ یہاں سے سیدھے لاکھ محل پہنچ جانا۔ تاکہ آگ لگنے سے پہلے وہاں پہنچ سکو" اُس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر لاکھ محل یہاں سے کافی دُور ہے!" مَیں نے اُسے بتایا "ایک بار ہم پہلے بھی وہاں جا چکے ہیں۔ تب ہم سب ساتھ تھے۔ آج ہم اکیلے ہیں ـــ میرے خیال میں ہمیں اُس کا یہیں انتظار کرنا چاہیئے ـــ ہو سکتا ہے ہمیں وہاں نہ جانا پڑے۔ کیوں کہ اگر مقصد صرف پانچ جمع ایک (۵+۱) لاشیں پوری کرنا ہے تو اپنی لاشیں ہم یہیں اُس کے حوالے کر دیں گے۔"

"شاید وہ اب نہیں آئے گا۔ وہ کوئی نہیں ہے۔ اور ہم اس کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں ـ جلدی کرو ـــ زمین کافی دھنس چکی ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ۔۔۔۔" وہ انتہائی خوف زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے ابھی اپنی بات بھی پوری نہ کی تھی کہ سامنے جلتے ہوئے پہاڑ نے باہیں پھیلا کر ہمیں اپنے قریب سرکالیا۔

میرے بھائی وہیں میرے منتظر تھے۔

آتش دان میں صندل کی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ دھواں اور سگندھ سبھی طرف پھیلی جا رہی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی زور کا طوفان شروع ہو گیا۔ ہَوا تیز تھی اور گھرے بادل سب طرف منڈلانے لگے تھے۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے ہر چیز پر پڑ رہے تھے، ہمارے جسم سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔

چوکیدار نے بھاگ کر سب کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے۔ مگر بارش کی بوچھاڑ پھر بھی اندر آ رہی تھی۔ فرش پر بچھا ہُوا بیش قیمت خوب صورت قالین جگہ

جگہ سے گیلا ہو گیا تھا اور پانی میں اس کے رنگ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر بہنے لگے تھے۔

چوکیدار آپ ہی آپ بولا ــ " وہ سب بڑے سمجھ دار لوگ تھے۔ ہم سب اکٹھے بازار گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر اس قالین کا رُوپ رنگ، بیل بوٹے پسند کئے تھے۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ رنگ کچے بھی ہو سکتے ہیں۔ کتنی محنت سے بنایا گیا ہو گا اِسے ؟ ــ اِسے بنانے والے اکثر رات کے اندھیرے میں چھُپ چھُپ کر یہاں آتے ہیں اِسے ایک نظر بچھے ہوئے دیکھتے ہیں اور شادمانی کے ساتھ واپس لَوٹ جاتے ہیں۔ اُن کے رتھ نیچے وادی میں کھڑے اُن کا انتظار کرتے ہیں اور اُن کے رتھوں کے گھوڑے ہنہنا کر اُنھیں پکارتے ہیں ــ اف ! مگر سب برباد ہو گیا۔ طوفان نے سب چوپٹ کر دیا ــ اب اگر کسی رات وہ آئیں گے اور اس کی بگڑی ہوئی صورت دیکھیں گے تو اُن کی گھٹی گھٹی چیخیں فضا میں گونج اٹھیں گی اور ان کے رتھوں کے گھوڑے پتھر بن جائیں گے۔ "

چوکیدار بہت اُداس ہو گیا تھا۔

مَیں اور وہ عورت جس کا مَیں سب سے بڑا خاوند ہوں تب تک دروازے ہی میں کھڑے رہے تھے۔ اُس نے ہماری طرف پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

" اندر آجائیے ــ اور اپنا نام رجسٹر میں درج کر دیجئے۔ طوفان تھمنے تک آپ کو یہیں رُکنا پڑے گا۔ " ہم دونوں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں بے انتہا کرب تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ڈیسک پر رکھا ہوا رجسٹر کھولا۔ اُس تاریخ میں یعنی کہ آج کی تاریخ میں جب کہ ہم یہاں پہنچے ہیں۔ ہمارے نام پہلے سے اِس میں درج تھے۔ اور ہمارے اصلی دستخط بھی موجود تھے ــ مَیں نے پچھلا صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں میرے باپ کا نام بھی درج تھا اور اُس کے دستخط بھی موجود تھے۔

مَیں نے چوکیدار سے پوچھا ــ " پتا جی کب آئے تھے اور اُن کے ساتھ کون تھا اور وہ یہاں کتنا عرصہ رُکے ؟ "

اس نے میرے سامنے ایک رکابی رکھتے ہوئے جس میں سوکھے ہوئے میوے تھے، کہا۔ " گو مَیں اِنھیں نہیں پہچانتا پھر بھی تمہارے چہرے کے خدوخال سے یہ اندازہ لگا سکتا

ہوں کہ ایک بار جب طوفان کے کوئی آثار نہیں تھے تم اپنے باپ کی حیثیت سے آئے تھے تمہارے
ساتھ تمہاری بیوی یعنی کہ تمہاری ماں تھی۔ وہ حاملہ تھی۔ شاید تم اس کے حمل میں تھے۔
تمہارے باپ نے کہا تھا کہ اُسے آتش دان کے سرد ہونے کا خطرہ ہے۔ میں جنگل سے ڈھیر
ساری لکڑیاں کاٹ لایا۔ اُس نے بے تحاشہ لکڑیاں آتش دان میں پھینکنی شروع کیں۔
خوب شعلے بلند ہوتے اور تمہارے باپ کی بیوی یعنی کہ تمہاری ماں دردِ زہ سے چیخ اٹھی
صبح اُٹھ کر اُس نے مجھے کہا۔ بچّے کے لئے دُودھ کی ضرورت ہے خواہ کسی چارپائے کا ہو۔
کیونکہ بچّے کی ماں مر چکی ہے اور اُس کی چھاتیوں میں رکا ہوا دُودھ زہریلا خون بن چکا ہے۔
مَیں نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر جنگل کی طرف رُخ کر کے آواز دی لیکن مجھے یاد ہے
کوئی مادہ چارپایہ نہ آیا۔ تم بھوک سے بلکتے رہے۔ آخر تمہارے باپ نے اپنی شہ رگ کاٹ کر
تمہیں اپنا خون پلایا۔۔ اور مَیں نے دیکھا تم نے اپنے ہونٹوں پر اپنی ننھی سی زبان پھرائی۔۔۔۔"

"بس ۔۔۔ بس ۔۔۔ بس!" مَیں دَہاڑا یہ بہت ہو چکا۔ عجیب بات ہے۔ یہ میری داستان
ہے۔ اور مَیں اِس سے واقف نہیں اور تم مجھے یہ سب بتا رہے ہو۔ مجھے اِسی بات کا رنج ہے
کہ مَیں اپنی داستان جاننے کے لئے دوسروں کا محتاج ہوں۔۔ مگر سنو! خدا کے واسطے
ہم پر رحم کرنا۔ رات جب طوفان تھم جائے گا اور ہم دونوں یعنی مَیں اور میری عورت بالکل
برہنہ ہو کر اپنے شہر سے دوسرے شہر تک سفر پر روانہ ہو چکے ہوں گے تو اِس لاکھ محل کو
آگ نہ لگا دینا۔۔ تمہیں اگر لاشوں کی گنتی پوری کرنی ہو گی تو وعدہ رہا۔ جب صبح سورج
اِس پہاڑ کے پیچھے سے جھانکے گا۔۔ ہم دونوں اپنی اپنی لاش تمہارے سپرد کر دیں گے۔"

چوکیدار کے چہرے پر لجاجت کا ہلکا زرد رنگ پھیل گیا" آپ مجھے چھما کریں میں
مجبور ہوں۔۔ آپ بھی مجبور ہیں ۔۔ ہم سب مجبور ہیں۔ مجھے اِس قالین کے رنگ بہہ
جانے کا رنج ہے۔ آخر ہر کمینگی کی کوئی حد بھی تو ہوتی ہے ۔۔ جب اتنی محنت ہی کی تھی
تو تھوڑا اور انتظار کر لیتے تاکہ رنگ تو پختہ ہو جاتے۔" اور وہ یک دَم خاموش ہو کر دھیرے
سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مَیں نے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ طوفان ابھی تک گرج رہا تھا

اور میرے کمرے کی دہلیز پر میرے بھائیوں کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ عورت سارے کپڑے اتار کر بالکل برہنہ ہو چکی تھی اور اب آہستہ آہستہ کونے میں بچھے ہوئے پلنگ کی طرف جا رہی تھی۔ جب میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ پلنگ پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے جسم کو جو ہلکی مدھم روشنی میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے کہا" ہم شاید پہلے بھی یہاں آچکے ہیں!" اُس نے انگڑائی توڑتے ہوئے جواب دیا" ہاں ... بہت عرصے کی بات ہے جب میں نے تمہاری خواہش ظاہر کی تو میرے باپ نے تمہارے باپ کے ساتھ میری شادی کر دی۔ اور مجھے بتایا کہ تمہیں پانے کا اِس کے سِوا اور کوئی طریقہ نہیں، میں خاموش ہو رہی ۔"

" کچھ، کچھ مجھے بھی یاد آرہا ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا" اِس سے پیشتر بھی میں اپنے شہر سے تمہارے شہر کی طرف سفر کر چکا ہوں ۔"

" شاید!" اُس نے اپنی بانہیں میری طرف وا کر دیں۔ میں نے اپنا لباس اُتار دیا اور ایک اجنبی شہر کی گلیوں میں داخل ہو گیا۔

رات جب طوفان تھما تو وادی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز گونج اُٹھی۔ اور پھر رتھوں کے پہیوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی ــ میں نے سر اٹھا کر دیکھا ــ آتش دان میں لکڑیاں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازے کے پردوں کے ساتھ سرد ہوائیں سر ٹکرا رہی تھیں اور دو شہر ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتے ہوئے مارے سردی کے ٹھٹھر رہے تھے۔

میں نے ایک کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ سب ہاتھ میں مشعلیں لئے آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ وہ لاتعداد تھے۔ ہر طرف روشنی سی پھیل رہی تھی نیچے اُن کے رتھوں کے آگے جتے ہوئے گھوڑے کبھی کبھی ہنہنا کر اپنے اگلے سم زمین پر پٹک رہے تھے۔ وہ بڑے قدیم لوگ تھے۔ وہ صرف اِس قالین کو دیکھنے آئے تھے جو کبھی اُنھوں نے بنایا تھا۔

پھر وہی ہُوا جس کا خدشہ تھا۔ انھوں نے ہال کمرے میں بچھا ہُوا بھیگا ہُوا قالین دیکھا۔ اور اپنے پاؤں کے نیچے کے فرش پر بہا ہُوا، اس کا کچا رنگ دیکھا تو وہ بلبلا اُٹھے۔ انکے بیٹوں

کی آوازیں سن کر اپنے ہاتھ میں حقہ تھامے چوکیدار اپنی کوٹھری میں سے باہر نکلا اور حقے کے لمبے لمبے کش لیتا ہُوا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا وہ اُن کے درمیان آکھڑا ہُوا۔ اور پھر میں نے دیکھا اُس نے اپنے منہ سے دھواں اگلتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔

” بند کر دو یہ شور! کچھ شریف لوگ اندر کمروں میں سوئے ہوئے ہیں آپ لوگوں کو یوں چلانے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تم ایک بار اس شہر کو چھوڑ چکے ہو اپنے وقتوں میں تم نے ایک قالین بنایا۔ اسے ہم نے بچھا رکھا ہے۔ اب جو وہ گدلا گیا یا خراب ہو گیا تو ہم جانیں! تم بار بار یہاں کیوں آتے ہو۔؟ اور یوں کیوں روتے چیختے ہو۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ آج یہاں ایک ایسا آدمی آیا ہُوا ہے جس کی اپنی زمین دھنس چکی ہے۔ ذرا اُس کے غم کا بھی خیال کرو۔!“

وہ سب بالکل خاموش ہو گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی مشعلیں بھی بجھ گئیں۔ اور میں نے دیکھا۔ اندھیرے میں اُن کے چہرے بالکل سفید ہوتے جا رہے ہیں۔

صبح جب ہم سب بیدار ہوئے۔ تو میں نے دیکھا میرے کمرے کی دہلیز پر میرے بھائیوں کے جوتے موجود نہیں تھے۔ وہ سب لوگ لاکھ محل کے برآمدوں میں مجسمے بن کر کھڑے تھے اور نیچے وادی میں ان کے رتھ اور ان کے آگے جُتے ہوئے گھوڑے پتھرا چکے تھے۔

چوکیدار نے ہمارے دروازے پر آکر دستک دی۔ ”باہر آ جاؤ۔ لاکھ محل کو آگ لگانے کا سمے آپہنچا۔!“

میں بالکل گھبرا گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا کر سر باہر نکال کر چوکیدار کو کہا۔ ”میں نے رات سفر میں اپنا لباس کھو دیا ہے اور میں بالکل ننگا ہوں۔ مادر زاد ننگا۔ اور میرا اٹیچی کیس چھوڑے ہوئے شہر میں رہ گیا ہے میرے کپڑے اُس میں ہیں۔ تم ابھی آگ نہ لگانا ورنہ میں بالکل برہنہ ہی جل کر مر جاؤں گا۔“

مگر چوکیدار نے میری بات پر بالکل دھیان نہ دیا۔ اُس نے جلتے ہوئے پھونس کا ایک گٹھا اٹھایا اور لاکھ محل کے چاروں کونوں میں آگ لگا دی۔ میں نے دیکھا۔ میں اور برآمدوں میں رکھے مجسمے سب شعلوں کی لپیٹ میں ہیں۔ اور میری محبوبہ کا ننگا جسم گیلے گدلے قالین پر مردہ پڑا ہے۔ ایک دم سینما ہاؤس کے تمام دروازے کُھل گئے۔

سب طرف روشنیاں پھیل گئیں اور تماشائی قطاریں بنا کر باہر نکلنے لگے۔